جلد نمبر2
شمارہ نمبر2
المنار
اکتوبر 2015
مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج ، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

اس شمارے میں

مجلس ادارت

پتہ برائے خط وکتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA Website

رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡکِ وَ عَلَّمۡتَنِیۡ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۟ اَنۡتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾

اے میرے ربّ! تو نے مجھے امورِ سلطنت میں سے حصہ دیا اور باتوں کی اصلیّت سمجھنے کا علم بخشا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تُو دنیا اور آخرت میں میرا دوست ہے۔ مجھے فرمانبردار ہونے کی حالت میں وفات دے اور مجھے صالحین کے زُمرہ میں شامل کر۔

[12:102]

عن ابی ھُریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قال: ان اللہ عزوجل خلق ادم علٰی صورتہٖ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ یعنی اُسے اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے اور اس میں یہ اہلیت اور استعداد رکھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو ظلّی طور پر اپنا سکے۔

قرارداد تعزیت بروفات چویڈری محمد علی ساحب مُضطر
سابق پرنسپل تعلیم الاسلام کالج ربوہ

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن U.S.A کے جملہ ممبران نے یہ خبر بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ سنی کہ ہمارے ہر دلعزیز استاد محترم چوہدری محمد علی صاحب .M.A مورخہ ۱۴/ اگست ۲۰۱۵ء کو وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

چوہدری صاحب مرحوم نہ صرف ایک تجربہ کار پروفیسر ماہر تعلیم، منتظم اور تربیت کرنے والے وجود تھے بلکہ حقیقی عاشقِ خلافت اور فدائی اسلام تھے۔ انہوں نے نفسیات میں اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ جنگِ عظیم دوم کے تناظر میں متحدہ ہندوستان کے سیاسی مزاج کے مطابق کچھ عرصہ سوشلسٹ نظریات کے مداح رہے لیکن پھر جلد ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں احمدیت قبول کرنے کی توفیق دی۔

آپ ۱۹۴۴ء میں وہ نئے اجراء شدہ تعلیم اسلام کالج قادیان کے بالکل ابتدائی اساتذہ میں شامل کر لئے گئے اور ۱۱/ دسمبر ۱۹۷۹ء کو پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ محترم چوہدری صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کے تربیت یافتہ تھے۔ حضور کی قیادت میں انہوں نے تعلیمی و غیر تعلیمی سرگرمیوں میں طلباء کی بہترین راہنمائی کی توفیق پائی۔

ان کے شاگردوں، باسکٹ بال اور روئنگ (Rowing) ٹیم کے چیمپیئن کھلاڑیوں اور کالج میگزین المنار کے ادارتی ممبران نے آپ سے بہت کچھ سیکھا اور اپنے اپنے میدان میں بہترین کامیابیاں حاصل کیں۔ آپ کے یہ شاگرد اس وقت دنیا کے کونے کونے میں آباد ہیں۔ یہ اعزاز جماعت احمدیہ سے باہر بہت ہی کم اساتذہ کو حاصل ہے۔

ہم تمام طلبائے قدیم چوہدری صاحب کی شفقت، بذلہ سنجی اور ہمدری کے گواہ ہیں اور آج کی مجلس میں دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آپ کی روح کو کروٹ کروٹ آرام ملے اور اللہ تعالیٰ تمام پسماندگان کو آپ کی جدائی کے عظیم صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہم ہیں تعلیم الاسلام کالج کے طلبائے قدیم مقیم U.S.A

خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۱ اگست ۲۰۱۵ء

پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب کا ذکرِ خیر۔ خطبہ جمعہ میں

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہِ العزیز نے اپنے خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۱ اگست ۲۰۱۵ء میں چوہدری محمد علی صاحب مرحوم کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرمایا:

دوسرا جنازہ مکرم و محترم پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب ایم اے کا ہے جو آجکل وکیل التصنیف تحریک جدید تھے۔ 14/ اگست 2015ء کو ان کی وفات ہوئی۔ تعلیمی ریکارڈ کے مطابق ان کی پیدائش 1917ء کی ہے۔ چھوٹی عمر میں ان کو احمدیت سے تعارف ہوا۔ زمانہ طالبعلمی میں حضرت مولوی ظہور حسین صاحب مربی بخارا کے (دین) کے دفاع میں ایک پنڈت سے کئے گئے مناظرہ سے آپ پر احمدیت کا اچھا اثر پڑا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کے دوران محترم قاضی محمد اسلم صاحب جو وہاں پروفیسر تھے، صدر شعبہ فلاسفی بھی تھے۔ ان کی شخصیت اور اوصاف حمیدہ اور دعوت الی اللہ کی وجہ سے 1941ء میں آپ کو نوجوانی میں احمدیت کو قبول کرنے کی توفیق ملی۔ پھر آخری دم تک سلسلے کی خدمت میں مصروف رہے۔ آپ نہ صرف اپنے خاندان بلکہ اپنے گائوں میں بھی اکیلے احمدی تھے۔ بڑی جوانمردی سے آپ نے ان تمام حالات کا مقابلہ کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے فلاسفی کیا۔ پھر آپ نے 9/ اپریل 1944ء کو وقف زندگی کی درخواست حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں پیش کی اور حضرت مصلح موعودؓ نے درخواست کو ازراہِ شفقت منظور فرمایا۔ اس کے بعد تعلیم الاسلام کالج قادیان میں فلاسفی کے لیکچرر کے طور پر آپ کی تقرری ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پہلے لاہور میں اور پھر ربوہ میں اسی کالج سے وابستہ رہے۔ اس طرح آپ تعلیم الاسلام کالج کے بانی اساتذہ میں شامل ہوتے ہیں۔ کالج میں آپ فلسفہ، نفسیات، ادب اور انگریزی زبان پڑھاتے رہے۔ جون 1967ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے دورہ افریقہ اور یورپ کے دوران بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ان کو معیت کا شرف حاصل ہوا۔

1984ء میں آپ کا تقرر جامعہ احمدیہ میں بطور انگریزی کے پروفیسر کے ہوا جہاں آپ نے شعبہ انگریزی کے سربراہ کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ اسی طرح اس دوران میں حضرت مسیح موعودؑ کی کتب کے تراجم کی سعادت بھی آپ کو ملی۔

جب وکالتِ وقف نو کا قیام ہوا تو چوہدری محمد علی صاحب کو حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے پہلا وکیل وقف نَو مقرر فرمایا۔ پھر 1998ء میں تراجم کے کام کی وسعت کے پیش نظر حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی

طرف سے آپ کو وکیل التصنیف مقرر فرمایا گیا اور آخر دم تک آپ اس خدمت پر مامور رہے۔ آپ نے سلسلے کی بہت سی کتب کا اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی توفیق پائی۔ اس طرح آپ کو تقریباً 71 سال سلسلہ کی خدمات کی توفیق ملی۔ ایک طویل عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ اکیڈیمک کونسل اور بورڈ آف سٹڈیز کے ممبر رہے۔ یہ بہت ہی بڑا اعزاز ہے۔

آپ اُردو ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اُردو اور پنجابی زبان کے بلند پایہ قادر الکلام شاعر تھے۔ بڑے محنتی منتظم تھے۔ ہمدرد استاد تھے۔ مشفق نگران تھے۔ خلافت کے سچے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ نظام جماعت کے ساتھ اخلاص و وفا کا تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔ ریاکاری سے پاک، نرم خو، نرم زبان، انسانیت کے ہمدرد اور نیک انسان تھے اور یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ 13/اگست کو بھی آپ دفتر تشریف لائے اور تمام وقت دفتری امور کی انجام دہی کے بعد گھر گئے جہاں ان کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا لیکن جانبر نہ ہو سکے اور 13 اور 14/اگست 2015ء کی درمیانی شب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ پسماندگان میں ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب وکیل اعلیٰ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا۔ قادیان میں چھٹی ساتویں کا طالبعلم تھا۔ اس وقت فضل عمر ہوسٹل کی بنیاد رکھی جانی تھی اور یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ بنیاد رکھنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ بہرحال حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ وہاں تشریف لائے اور ہوسٹل کے صحن میں کھڑے کھڑے تقریر فرمائی۔ کہتے ہیں۔ میں چھوٹا تھا لیکن مجھے یاد ہے کہ حضور نے فرمایا کہ مولوی محمد علی صاحب بھی جالندھر سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی وہ مولوی محمد علی صاحب جنہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کے زمانے میں بیعت کی تھی اور پھر بعد میں خلافت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ حضرت خلیفہ ثانیؓ نے فرمایا کہ مولوی محمد علی صاحب بھی جالندھر سے تعلق رکھتے تھے اور چوہدری محمد علی صاحب جن کو اب میں ہوسٹل کا وارڈن مقرر کر رہا ہوں یہ بھی جالندھر سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مولوی محمد علی صاحب بھی آرائیں قوم سے تعلق رکھتے تھے اور چوہدری محمد علی صاحب بھی آرائیں قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر بعض نیک توقعات چوہدری محمد علی صاحب سے وابستہ کیں اور یہ حضرت مصلح موعودؓ کی دعائیں اور نیک توقعات تھیں جن کی وجہ سے چوہدری محمد علی صاحب کو مولوی محمد علی صاحب سے بڑھ کر حضرت مسیح موعود کی کتب کا ترجمہ کرنے کی توفیق ملی اور پھر ترجمہ بھی بڑا اعلیٰ معیار کا آپ نے کیا۔ بڑی گہرائی میں بغیر کسی لفظ یا فقرے اور مضمون کو چھوڑے اس حق کو ادا کرنے کی آپ نے کوشش کی جو ترجمے کا حق ہوتا ہے۔

مجیب الرحمن صاحب ایڈووکیٹ کہتے ہیں کہ 1939ء کے جلسے میں آپ چھپ کر شامل ہوئے اور 1940ء میں حضرت مصلح موعودؓ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ (یہ 1941ء ہے ویسے) آگے لکھتے ہیں کہ روزِ اوّل سے ہی خلافت کے عاشق تھے۔ حضرت مصلح موعودؓ کے بارے میں فرمایا تھا کہ

اے جان حسن مطلق اے حسن آسمانی

اے مست رو محبت اے تیز رو جوانی

کہتے ہیں کہ ان کی یہ مست رو محبت ہر خلافت کے ساتھ ایک تیز رو طغیانی کی شکل اختیار کر گئی اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی اور ان سے نشست خواہ کتنی ہی مختصر

ہوتی ان کی صحبت میں بیٹھنے والا خلافت کی محبت سے سرشار ہو کر اٹھتا اور بلا استثناء اس بات کا ہر ایک نے اظہار کیا ہے۔

ریاض احمد ڈوگر صاحب (مربی) سلسلہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں خاکسار کو جامعہ احمدیہ میں تعلیم کے دوران آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کہنے کو تو انگلش کے استاد تھے لیکن آپ نے ہمیں انگلش ہی نہیں وقف کی اہمیت، اخلاقیات، خلافت سے وفا، بزرگوں کا احترام، سلسلے کا وقار، سب کچھ سکھانے کی بھرپور کوشش کی۔ کہتے ہیں جب میں جامعہ سے فارغ ہو کر میدان عمل میں جانے لگا تو جامعہ سے باہر نکلا تو دیکھا کہ آپ ایک درخت کے سائے تلے کھڑے ہیں۔ آپ نے مجھے آواز دے کر بلایا اور بٹھا کر کہنے لگے۔ کیا کر رہے ہو، میدان عمل میں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں جی۔ کہنے لگے کہ میری دو باتیں یاد رکھنا اور یہ ہر (مربی) کے لئے، ہر مربی کے لئے بڑی ضروری ہیں کہ تم فیلڈ میں جا رہے ہو۔ چوہدری صاحب نے انہیں کہا کہ وہاں ریاض ڈوگر کو کوئی نہیں جانتا۔ احبابِ جماعت تمہارے پاس حضرت مسیح موعودؑ کا نمائندہ سمجھ کر آئیں گے اور حضرت مسیح موعودؑ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَا تَسْئَمْ مِنَ النَّاسِ۔ کہ لوگوں سے اکتانا نہیں۔ ایسا ہو گا کہ تم تھکے ہو گے، تمہارا سر درد کر رہا ہو گا، تمہارا سونے کو دل چاہ رہا ہو گا۔ ایک آدمی کو نیند نہیں آ رہی ہو گی وہ تمہارے پاس آ جائے گا۔ اس کے سامنے بھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرنا یعنی تمہاری جیسی مرضی حالت ہو اگر کوئی شخص بھی آتا ہے وہ کسی وجہ اور پریشانی کی وجہ سے آتا ہے یا جس وجہ سے بھی آتا ہے کبھی تم نے اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرنا۔ پھر کہنے لگے کہ دوسری بات یاد رکھو۔ تم جماعتوں میں جاؤ گے بعض لوگ تمہاری کمزوریوں کی نشاندہی کریں گے اور نشاندہی کریں تو بشاشت کے ساتھ قبول کر کے اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔ بعض لوگ مقامی عہدیداروں پر تنقید کریں گے۔ کہنے لگے یہ بہت بری بات ہے۔ نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن سنی جا سکتی ہے۔ سن لینا برداشت کر لینا۔ آگے کہنے لگے لیکن اگر کوئی خلافت یا خلیفۃ المسیح پر اعتراض کرے تو تمہاری برداشت کی تمام حدیں ختم ہو جانی چاہئیں۔ پھر کوئی برداشت نہیں کرنی۔ کہنے لگے میری یہ دو باتیں یاد رکھنا انشاء اللہ میدان عمل میں سارے کام آسان ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر نوری صاحب کہتے ہیں کہ چوہدری محمد علی صاحب کو جب یہ جان لیوا ہارٹ اٹیک ہوا اور آپ کو ہسپتال لے جایا گیا تو اس دوران آپ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور مسلسل خدا تعالیٰ کی حمد میں مصروف رہے۔ طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ ربوہ میں جب شروع ہوا ہے تو اس وقت آپ رجسٹر ہونے والے پہلے مریض تھے۔ ان کو پرانی دل کی بیماری تھی۔ کئی دفعہ ہسپتال داخل ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا دی جس کے بعد آپ پھر خدمت میں مصروف ہو جاتے۔ ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس اہم کام کو سرانجام دینے کی توفیق دے اور ہمت دے جو خلیفۂ وقت نے میرے سپرد کیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ کی آواز بھرا جاتی اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہ بخش دے۔ میری کمزوریاں بخش دے۔ ساری خطائیں معاف کر دے اور اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت اور اس کا قرب مجھے عطا ہو۔

مظفر درانی صاحب مربی لکھتے ہیں کہ جب میں آنے لگا تو ملنے گیا۔ انہوں نے پوچھا تو بھرائی ہوئی آواز میں انہوں نے مجھے سلام پہنچانے کے لئے کہا۔ کہتے ہیں آپ کو خلافت سے سچی اور حقیقی محبت تھی۔ جس خلیفہ کا بھی تذکرہ کرتے تو نہایت محبت سے ذکر کرتے اور ذاتی

تعلقات کے واقعات بیان کرتے چلے جاتے۔ جس خلیفہ کا بھی ذکر شروع ہو جاتا تو ایسے لگتا کہ آپ اسی کے عاشق ہیں۔ لکھتے ہیں کہ خاکسار آپ کی ملاقاتوں اور صحبت کے نتیجے میں عرض کرتا ہے کہ آپ خلافت کے سچے فدائی تھے اور تمام خلفاء کے عاشق تھے اور یہی ایک حقیقی مومن اور حقیقی احمدی کی نشانی ہے۔

پروفیسر ثناء اللہ صاحب کہتے ہیں کہ چوہدری محمد علی صاحب خلافت احمدیہ کی ایک زندہ تاریخ تھے جن کی زندگی کا واحد مقصد خلافت کی جاں نثاری تھا اور جن کا فخر یہ شعر تھا۔

کریں نہ کریں وہ تمہیں قتل مضطر
جھکا دینا تم اپنا سر احتیاطاً

مبارک صدیقی صاحب کہتے ہیں ایک دفعہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دو تین دفعہ یہ موقع ملا تھا اور ان کو کہا کہ انتخاب سخن پروگرام میں آپ کی فلاں فلاں نظموں کی لوگ بڑی فرمائش کرتے ہیں۔ اس بات پر آپ کہنے لگے میرے کلام کا کوئی ہنر نہیں ہے۔ یہ سب خلافت کی برکات ہیں۔ میں تو صرف احمدیوں کے دلوں کی ترجمانی کرتا ہوں اس لئے لوگوں کو اچھا لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ رحم اور مغفرت کا سلوک فرمائے اور ان جیسے مخلص اور فدائی، خلافت کے شیدائی اللہ تعالیٰ جماعت کو ہمیشہ عطا کرتا چلا جائے۔

☆☆☆☆☆

اکیسویں صدی کی غزل الغزلات

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

ہر زمانہ میں ایسے نابغے موجود رہے ہیں جو اپنی فنی بصیرت، فکری پختگی، زبان وبیان پر بے پناہ قدرت، حرفوں کی مزاج شناسی اور لفظوں کی طلسم گری کی وجہ سے اپنا وجود منواتے اور علمی اور ادبی دنیا میں اپنا مقام بزورِ فن منواتے ہیں۔ انہیں کسی کی توصیف وثنا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا کہا خود ان کا مقام متعین کرتا ہے۔ ان کا قول ہوتا ہے۔

ہم نے اظہار کی راہیں کھولیں
ہم نے لفظوں سے بغاوت کی ہے

اور لفظوں کے یہ باغی ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جب وقت یہ پکارنے لگے کہ

تم عہد کے حالات رقم کیوں نہیں کرتے؟

تو اس وقت یہی لوگ اپنی اپنی زبور اٹھائے سامنے آجاتے ہیں۔ میں ایسے ہی ایک نابغہ کا ذکر کرنے جارہا ہوں جس نے اکیسویں صدی میں نئے لہجہ کی غزل الغزلات تصنیف کی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ "لفظ مر جائیں تو مفہوم بھی مر جاتے ہیں" اس لئے اس نے لفظوں کو مرنے اور کاغذ کو خون سے بھرنے نہیں دیا۔ وہ اپنے عہد کے آشوب سے دوچار ہے۔ دیکھتا ہے اور حیران ہے کہ

کس نے آنکھیں بنا کے پھینک دیا
اتنے چہروں کے درمیان ہمیں؟

اتنے چہروں میں اسے آدمی کوئی نہیں ملتا۔

جس سے پوچھو وہی فرشتہ ہے
کیا کوئی آدمی نہیں ہم میں؟

پھر خود ہی جواب دیتا ہے۔

جس سے پوچھو وہی فرشتہ ہے
آدمی کوئی خال خال ہوا

اس قحط الرجال کے زمانہ میں اس کے سامنے ایک ہی جواب ابھرتا ہے کہ ہزار سال کے بعد آسمان بولا ہے ازل سے یہی دستور آسمانی چلا آتا ہے کہ

رہائی ملتی ہے آواز کو اسیری سے
ہزار سال کے بعد آسمان بولتا ہے

اور سارے لوگ اس کے سامنے سینہ سپر ہو کر اس کا راستہ روکنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اسی ہمہ گیر مخالفت نے اسے سوچنے پر اکسایا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ

لوگ اتنے خلاف ہیں اس کے
وہ کہیں عہد کا رسول نہ ہو

اس نے محسوس کیا

خوشبو پہن کے نکلی ہے آواز عہد کی
لگتا ہے کوئی صاحبِ الہام آئے گا

گلِ مراد کھلا تھا ہزار سال کے بعد
چمن کا ورنہ روایات پر گذارا تھا

میں اپنی ذات سے آگے سفر پہ کیا جاتا
کہ اس جزیرے کے چاروں طرف کنارا تھا

مگر اس نے اپنی ذات کے جزیرے کو تج کر وقت کے مامور کا دامن تھام لیا۔ غزل الغزلات اپنے عہد کے رسول کی مہما میں لکھی گئی ہے۔ ''اشکوں کے چراغ'' اس دور کی زبور ہے۔ مظطر عارفی اپنے مرشد کے لفظوں میں ''میں ہوٗ اداوٗد اور جالوت ہے میرا شکار'' کا مظہر ہے۔ اس کا نعرہ ہے کہ

اب نہ الفاظ کے کژدم ہیں نہ آواز کے سانپ
اب کسی جھوٹ کو آئے گا نہ اژدر ہونا

وہ وقت بھی آیا کہ

لفظ ننگے پاؤں ننگے سر بھرے بازار میں
پھر رہے تھے اور ان کو کوئی ٹوکتا نہ تھا

شاعر نے انہیں ٹوکا تو

پھر وہی اظہار کی سولی ہے اور مضطر ہوں میں
پھر مجھے لفظوں نے آگھیرا اکیلا دیکھ کر

ایک دو لحظوں کے لئے اسے گماں تو ہوٗا ہو گا کہ شاید وہ تنہا ہے مگر اندر کی آواز نے اسے دلاسا دیا

اسے اتنی حقارت سے نہ دیکھو
اکیلا ہے مگر تنہا نہیں ہے

یہ ایک اکیلی روح کی شاعری ہے جس کی تنہائی آباد اور جس کی آواز اپنے عہد کی آواز ہے۔

منصور ہوں میں آخری صدی کا
سولی مرا انتظار کر لے

وہ اپنی سولی کے انتظار میں چشم براہ ہے اور سولی اس کی راہ تک رہی ہے۔ بیسویں صدی میں اس کے ہم عصر شعرا نے دار ورسن اور سولی کے بہت مضمون باندھے ہیں مگر اس کی سولی انوکھی ہے۔

جس کے نصیب میں ہو کھلے شہر کی صلیب
اس خوش نصیب کی ہو خوشی کا ٹھکانہ کیا

کھلا شہر؟

اب آج سے اس شہر کا ہر شخص ہے مجرم
نوٹس یہ کھلے شہر کے تھانے پہ لگا ہے

یہ بیسویں صدی کا انوکھا واقعہ تھا کہ شہر کے شہر کے خلاف فرد جرم عاید ہوئی۔ کسی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ عام عوام بے حس، خواص مصلحت پسند، دانشور خاموش اور لوگ خوف زدہ ہو جائیں تو وہی رجیم مسلط ہو جاتی ہے جس کے بارہ میں مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے کہ "اس دور زیاں میں جب بھی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھتا ہوں لگتا ہے اس رجیم سے مراد یہی رجیم ہے"۔ (آبِ گم صفحہ ٦١)۔ زمانہ اسی کھوج میں ہے۔

سولی کو جو سجا سکے وہ سر تلاش کر
اے شیخِ شہر پھر کوئی کافر تلاش کر

اور میں

عاشقِ صادق ہوں فرزانہ نہیں
میرے اندر عقل کا خانہ نہیں

اس لئے زمانہ سازوں نے اپنی کرسی بچانے کی فکر میں ایک پورے گروہِ وفاشناساں کو کافر قرار دے دیا۔

وہ اک حسین تھا اس عہد کے حسینوں میں
اسے کسی نے تو کافر قرار دینا تھا

حکومت میں اور ملا میں گٹھ جوڑ ہوا

حکومت اور ملائے حزیں میں
سنا ہے کہ خدائی ہو رہی ہے

ہوئی۔ مگر

آسماں پر ہو چکا تھا فیصلہ اس کے خلاف
وہ جو تھا اہلِ زمیں نے فیصلہ لکھا ہوا
ہمی نے وقت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر
اسے کہا تھا جلدی میں فیصلہ نہ کرے

کیونکہ

زمین سب سے بغل گیر ہو کے پوچھتی ہے
وہ کون ہے کہ جو مجھ سے معانقہ نہ کرے

مگر اس کو اپنی کرسی کا زعم تھا۔

نہ شوخی بگھار اپنی کرسی کی اتنی
مکافات سے کچھ تو ڈر احتیاطاً

مگر اس کے سر پر سینچر سوار تھا۔ کوئی منتر کام نہ آیا

بیدجی کرسی کے کاٹے کا بھی کچھ کرتے علاج
کوئی پوتھی کھول لیتے کوئی منتر دیکھتے

ہمارا کہا اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

ہم فقیروں کے قتل سے پہلے
اپنے انجام پر نظر کرنا

تم عہد کی آواز سے ڈر کیوں نہیں جاتے
پندار کی سولی سے اتر کیوں نہیں جاتے؟

اور پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔

جس کا دعویٰ تھا مری کرسی بڑی مضبوط ہے
ذکر اس کا داستاں در داستاں کوئی نہ تھا

اب رہے ہم کافر؟ تو۔

فتوے کٹھ ملاؤں کے
جوتے میرے پاؤں کے!

میں ایک ہوں کبھی تقسیم نہیں ہو سکتا
اگرچہ بانٹ لو تم مل کے آدھا آدھا بھی

منسوخ نہ ہو سکوں گا ہر گز
قدرت کا اٹوٹ فیصلہ ہوں

بولوں تو ہوں عہد کی علامت
خاموش رہوں تو معجزہ ہوں
پھر وہ دور آ گیا جب ایک نئی سولی گاڑ دی گئی۔
ہم مؤذن ہیں عہد کے لیکن
کوئی دینے بھی دے اذان ہمیں
جو نیا فرعون اٹھا اس کا حال یہ تھا۔
سوائے اپنے اسے کچھ نظر نہ آتا تھا
فقیہِ شہر کے سر میں فتور اتنا تھا
سارے ملک کے اخباروں کی گویا لگامیں کھل گئیں۔ ہر قسم کا رطب و یابس چھپنے لگا۔ سچ لکھنے پر پابندی لگ گئی۔ جھوٹ لکھنا اہل ہوس کا شیوہ ٹھہرا اور آذوقہ۔
اگر آتا نہ ہو انکار پڑھنا
کبھی اس عہد کے اخبار پڑھنا
تم اپنا جھوٹ خود پڑھ کر سنا دو
ہمیں آتا نہیں سرکار پڑھنا
اور اگر ہم نے سچ لکھنا چاہا تو
لگتا ہے نماز پڑھ رہے ہیں
لفظوں کی کٹی ہوئی ہیں بانہیں
مگر اتنی تسلی رہتی ہے۔
دھوپ کی شدت ہے سولی تک
آگے سایہ ہی سایہ ہے

پھر وہی ہؤا جو ایسوں کا انجام ہؤا کرتا ہے۔
نسخہ بن کر پس جاؤ گے نادانو
جب تقدیر کا ہاون دستہ بولے گا

جس کو ہر لیکھرام جانتا ہے
میں وہی مرگِ ناگہانی ہوں
یہ سارا پس منظر اس شہر آشوب کا ہے جس سے مضطر عارفی اور اس کا قبیلہ گذرا۔ اس نے لفظوں کے استعمال میں بچت کی نہ اسراف۔
کوئی تو سمجھے گا اس عہد کے آدم کی زباں
شہر مسحور میں کوئی تو بشر بھی ہو گا
وہ اس کوہ ندا کی آواز سن کر پتھر نہیں ہؤا۔ اس نے کہا
ہم اشاروں میں بات کرتے ہیں
ہم نے ڈالی نئی زبان کی طرح

سب راستے گذرتے ہیں اس کے قریب سے
صحرائے نینوا میں جو چئیرنگ کراس ہے

میں بھی پیاسا ہوں کسی کی دید کا
میرے اندر بھی ہے اک تھر پارکر

چاند کھڑا ہے مدت سے دروازے پر
چہرہ بھی پیلا سا ہے بیمار نہ ہو

اشکوں میں ہیں انا کی چٹانیں چھپی ہوئی
جیسے سمندروں میں ہمالے پڑے ہوئے

کوچہ و بازار میں برسا لہو
بادلوں کی رت میں آنکھیں آئیاں

عشق اس کے عہد میں بے دست و پا ہو جائے گا
آنکھ استنبول سینہ قرطبہ ہو جائے گا

اور اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ

خدا کرے آسماں کا خیمہ رہے سلامت
مکین بھی اب تو کہہ رہے ہیں مکاں گرے گا

اپنے سائے سے ڈر رہے ہیں لوگ
جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں لوگ

یہ اس عہد کا المیہ ہے جس کو ہمارے کم فہم حاکموں اور پیٹ پرست ملاؤں نے مل کر پیدا کیا ہے۔ مضطر نے کیا سادہ انداز میں بات کہی ہے کہ

سب دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں
جس قدر صاحبان بیٹھے ہیں
کہ یہ غلط تو نہیں کہ

کشتہء تیغ انا لگتا ہے
واعظِ شہر خدا لگتا ہے
اس کو کرو کمال اتاترک کے سپرد
ملا کو آزمانے کے بعد آزمانا کیا

ہمارا کیا ہے۔

کس قدر وضع دار ہیں ہم لوگ
قبر میں بھی سفید پوش رہے

تاریخ بتاتی ہے کہ بہت خدا بننے والے آئے اور چلے گئے۔ خدا وہی ہے جو ایک ہے۔ خدا وہی ہے جو خدا ہے۔

سمت ہے اس کی نہ حد
قُل ہُو اللّٰہ اَحد!!

یہ غزل الغزلات خدا کی احدیت اور اس کی احدیت کے سایہ میں ستانے والوں کا نغمہء مستانہ ہے۔

چلتے چلتے مضطر نے ہمارے اور اپنے مرحوم یار پروفیسر نصیر احمد خاں کو جو خراج پیش کر دیا اس کا ذکر کئے بغیر بات ختم کرنے کو جی نہیں مانتا۔

تم بھی اے کاش کہہ سکو مضطر
شعر کوئی نصیر خان سا ایک

☆☆☆☆☆
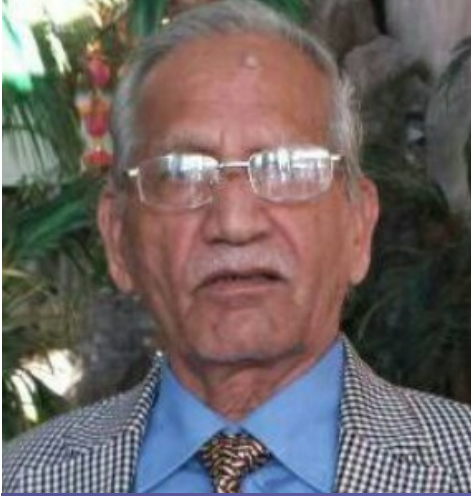
بیادِ چوہدری محمد علی صاحب
مضطر عارفی

پروفیسر مبارک احمد عابدؔ۔ فلاڈیلفیا امریکہ

نقشِ پائے یار کو اس نے بنا کر رہگزر
طے کیا اپنا مصافِ زندگانی کا سفر

نصف شب کا تھا وہ سورج برف جس کے چار سو
نور سے پُر اُس کا سینہ اور دل دیپک نگر

نرم تر مانندِ خوشبو اس کا طرزِ گفتگو
چاند کی کرنیں فروزاں عظمتِ کردار پر

ذکر جب جب بھی چھڑا اس کے حسیں محبوب کا
ہونٹ اس کے کپکپائے، تھرتھرائی چشم تر

فلسفہ میں طاق تھا وہ اور ادب میں بے مثال
منفرد طرزِ سخن میں یکتائے علم و ہنر

جس میں تھا ہر ایک پل "تنہائی تنہائی" کا شور
دائرہ در دائرہ تھا اس کے جیون کا سفر

برسوں وہ اک میکدے میں ساقی گلفام تھا
اک ہجوم مے گساراں اس کے تھا زیرِ اثر

ہر کسی موسم میں ہر اِک حال میں اور ہر جگہ
جانبِ دلبر رہی ہر آن نم دیدہ نظر

وقف کی بہرِ خدا اس نے حیاتِ مستعار
گلشنِ احمد کے تا پھولیں پھلیں برگ و شجر

شدتِ احساس تھی اس کی کتابِ عمر میں
جس کے اِک اِک باب کا ہے ہر حوالہ معتبر

ہر قدم پر اک نئے اخلاص کا روزن کھلا
اس کی یادوں کے جو عابدؔ میں نے کھولے بام و دَر

☆☆☆☆☆

پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب مرحوم کی یاد میں

پروفیسر عبد الجلیل صادق

پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب مرحوم سے خاکسار کا تعارف اور تعلق تین حیثیتوں سے رہا ہے۔ ایک طالب علم کے حوالہ سے اور دوسرا Colleague یا رفیق کار اور تیسرا پرنسپل ہونے پر Subordinate کے طور پر۔ تینوں حیثیتوں یا پہلوئوں سے ان کی چھاپ بڑی گہری اور پائیدار ہے۔ 1958ء سے 1963ء تک خاکسار ایک طالب علم کی حیثیت سے تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتا رہا۔ اس وقت پروفیسر صاحب موصوف فلاسفی کے سینئر پروفیسر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اور کشتی رانی اور بعد میں باسکٹ بال کے انچارج کے طور پر کالج میں نمایاں حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب جو اس وقت کالج کے پرنسپل تھے، کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ہم سب طلباء اس وقت موجود پروفیسر صاحبان۔ میاں عطاء الرحمن صاحب، صوفی بشارت الرحمن صاحب، شیخ محبوب خالد صاحب، ابراہیم ناصر صاحب، صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب، صاحبزادہ مرزا مجید احمد صاحب، مکرم نصیر خان صاحب، مکرم حبیب اللہ خان صاحب وغیرہ کی علمیت اور بزرگی سے متاثر بلکہ مرعوب تھے۔ علم و دانش بکھیرنے والے ستاروں کا ایک جھرُمٹ تھا۔ چوہدری محمد علی صاحب مرحوم کے مضمون سے براہِ راست تو استفادہ نہ کر سکا، تاہم ان کے علمی لیکچرز، مشاعروں میں ان کا کلام اور باسکٹ بال میں ان کی غیر معمولی دلچسپی سے بیحد متاثر رہا۔ میں والی بال کا کھلاڑی تھا اور چوہدری صاحب اکثر و بیشتر مجھے باسکٹ بال میں آنے کے لے تحریک کرتے رہتے تھے جس کو میں خاموشی سے ٹال دیتا کیونکہ ان ایام میں باسکٹ بال والوں کو روزانہ تین وقت کورٹس میں حاضری دینا ہوتی تھی اور باسکٹ بال کے کھیل کے فروغ میں ٹی آئی کالج ایک کلیدی رول ادا کر رہا تھا۔ بورڈ، یونیورسٹی اور پنجاب لیول پر ہمارے کالج کے کھلاڑی اپنا لوہا منوا رہے تھے جس کے لئے شروع میں پروفیسر نصیر خان صاحب اور بعد میں پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب نے غیر معمولی محنت کی اور کروائی۔

1964ء میں ایم اے پولیٹیکل سائنس کرنے کے بعد میری تقرری بطور استاد انگریزی ہوئی اور 1966ء میں خاکسار نے انگریزی میں ایم اے بھی خدا تعالیٰ کے خاص فضل سے پاس کر لیا۔ اب مجھے ان کے ایک جونیئر رفیق کار کے طور پر کام کرنے کی توفیق ملی۔ اس حیثیت سے انہوں نے ہمیشہ میری راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ کالج کے قومیائے جانے کے بعد ایک ایسا وقت بھی آیا جب میرے سوا انگریزی کے شعبہ میں کوئی اور استاد نہ تھا۔ شریف خالد صاحب مرحوم کی ریٹائرمنٹ ہو چکی تھی۔ صاحبزادہ مرزا خورشید صاحب انجمن میں جا چکے تھے۔ چوہدری حمید صاحب بیرونِ پاکستان جا چکے تھے۔ چوہدری

صاحب موصوف اس وقت کالج کے پرنسپل ہوتے ہوئے فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کی پوری کی پوری کلاس کیمسٹری تھیٹر میں لیا کرتے تھے۔ جبکہ بی اے، بی ایس سی کے لئے NDVP کی سکیم شروع ہونے کی بناء پر مسعود خان صاحب، حبیب صاحب، سفیر الحق رامہ صاحب، بشیر خان صاحب اور نعمت اللہ صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔ یہ صورت حال تقریباً دو سال رہی اور موصوف نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ تدریسی کام نہایت احسن رنگ میں ادا کیا۔ بلاشبہ آپ کی انگریزی بڑی مستند اور Authoritative تھی اور ہم جیسے ان کے سامنے محض طفل مکتب تھے۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ ان ایام میں جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے ربوہ میں باسکٹ بال کا کھیل بڑا مقبول تھا۔ کالج کورٹس کے علاوہ آٹھ دس جگہ باقاعدگی سے کھیل ہو رہا تھا۔ باسکٹ بال کی ایک اہم میٹنگ لاہور میں غالباً Carson Institute میں ہوئی۔ چوہدری صاحب موصوف کے ساتھ میاں محمد ابراہیم صاحب جمونی، اسلم صابر صاحب، محمد اسلم شاد صاحب منگلا اور خاکسار کو بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ میٹنگ شروع ہوئی۔ کوئی میجر صاحب اس میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے۔ جب چوہدری صاحب موصوف کچھ کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تو میجر صاحب نے کمال فراخ دلی سے یہ اعتراف کیا اور کہا "چوہدری صاحب ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ آپ کی انگریزی اور طرز استدلال ایسا منطقی اور دل موہ لینے والا ہے کہ کوئی اس سے اختلاف نہ کر سکے گا بلکہ سب ممبران آپ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔" یہ تھا وہ خراجِ تحسین جو اس وقت صدرِ مجلس نے آپ کو پیش کیا۔

مکرم چوہدری صاحب موصوف اپنے احمدیت قبول کرنے میں قاضی محمد اسلم صاحب ایم اے (Contab) جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے فلاسفی کے استاد اور اسی کالج کے پرنسپل اور ریٹائرمنٹ کے بعد ٹی آئی کالج کے پرنسپل رہے، کا ذکر بڑے ادب اور احترام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح زندگی وقف کرنے پر حضرت مصلح موعود نور اللہ مرقدہ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کی شفقت اور عنایات کا ذکر بڑے ہی جذباتی اور ایمان افروز پیرایہ میں کیا کرتے تھے۔ آپ کے MTA کے پروگرام اور انصار اللہ پاکستان کے تحت ترتیب دیئے گئے پروگرام اور مشاعروں میں پیش کیا جانے والا پروگرام اس کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

حضور انور ایدہ اللہ نے آپ کے سپرد وکالت تصنیف کا کام کیا ہوا تھا۔ آپ اسے بڑی احتیاط، فکر اور عرق ریزی سے سرانجام دیتے۔ دو ایک مرتبہ ترجمہ کرتے وقت خاکسار کو بھی یاد فرمایا۔ تین چار دوست کمرہ میں موجود ہوتے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کسی کتاب کا ایک اقتباس اور بعض دفعہ چند فقرے زیر نظر ہوتے۔ تمام دوستوں سے رائے لیتے۔ ڈکشنری اور دوسری ادبی کتب ساتھ ہوتیں اور پھر بڑی احتیاط اور گہرائی میں جا کر سیاق وسباق کے مطابق اور اس سے بڑھ کر جماعت کے اسلوب اور Diction کو مدنظر رکھتے ہوئے جماعتی روایات کے مطابق اسے سرانجام دیا جاتا تا ترجمہ کے دوران کسی طرف سے اگر مناسب الفاظ یا Term سامنے آتی تو اسے Welcome کیا جاتا اور پھر مزید کھنگالنے کے بعد اسے رکھا جاتا۔ چوہدری صاحب موصوف ایسی صورت میں رائے کی حوصلہ افزائی فرماتے اور ہر اچھی رائے کو خوش دلی سے قبول کرتے لیکن آخری مرحلہ بڑی احتیاط اور تسلی سے سرانجام دیا جاتا۔

☆☆☆☆☆

اک ستوں اور گرا، اک چراغ اور بجھا

چوہدری محمد علی صاحب ۔ مضطر عارفی

عبد الہادی ناصر۔ سابق لیکچرار تعلیم الاسلام کالج

جو بادہ کش تھے پرانے، وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی!

جماعت احمدیہ کے مایہ ناز فرزند حضرت چوہدری محمد علی صاحب کی وفات جماعت احمدیہ کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ آپ کی وفات سے بہت بڑا خلا واقع ہو گیا ہے جس کو پُر کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی کو جماعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور اس عہد وفا کو اپنی آخری سانس تک نبھایا۔ آپ نے احمدیت اس وقت قبول کی تھی جب آپ کالج میں طالب علم تھے۔ گورنمنٹ کالج میں قاضی محمد اسلم صاحب سے بہت مرعوب تھے۔ جو ان دنوں کالج میں پڑھاتے تھے۔

چوہدری محمد علی صاحب نے جماعت احمدیہ کی 71 سال خدمت کی۔ آپ کے سپرد مختلف کام سپرد کئے گئے جو آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔

میری ذاتی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں 1966ء میں لیکچرار تھا۔ اس سے قبل میں آپ کو جانتا تھا مگر ذاتی طور سے آپ سے نہیں ملا تھا۔ سٹاف روم میں مکرم قاضی محمد اسلم صاحب نے میرا تعارف سٹاف سے کروایا۔ چوہدری صاحب نے جاتے ہوئے مسکراتے ہوئے معانقہ کیا اور مجھے Well Come کیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپ مجھ سے برسوں سے آشنا ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ تعلیم الاسلام کالج کے ہوسٹل میں ٹیوٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا، چوہدری صاحب ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ کالج کے بعد اکثر آپ کے پاس بیٹھنے کا موقع ملتا رہا۔ اس طرح آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آپ طویل عرصہ تک ہوسٹل کے سپریڈنڈنٹ رہے۔

میں نے دیکھا کہ آپ ہوسٹل کے طلبہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آپ ٹیوٹرز کو اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ غریب طلباء کا خاص خیال رکھا کریں ۔اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ غریب طلباء کو اپنی

عزت کے سامنے کبھی بھی اپنی محرومیوں کا تذکرہ نہیں کرتے۔نہ اظہار کرتے ہیں۔حالانکہ وہ مدد کے قابل ہوتے ہیں۔ہم ایسے طلباء کی تلاش میں رہتے تھے۔جب ہمیں ایسے طلباء کا علم ہوتا تو چوہدری صاحب کو آگے کرتے۔جب انہیں ایسے طلباء کا علم ہو جاتا تو ان کی ہر طرح مدد کرتے۔کسی کی فیس کی رعایت میں کسی کی کتب وغیرہ کسی کے کھانے کا انتظام فرماتے اور ایسے طریق سے کرتے کہ کسی کو خبر نہ ہونے دیتے۔ یہ عمل سالہا سال جاری رہا۔نہ معلوم کتنے طلباء کی مدد فرماتے رہے۔

آپ ہوسٹل کے طلباء کے احساسات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ایک دفعہ ہوسٹل سے ایک طالب علم اجازت لئے بغیر ہوسٹل سے رات باہر رہا۔ میں نے چوہدری صاحب کو مشورہ دیا کہ آئندہ عشاء کے بعد ہوسٹل کے طلباء کی حاضری کے بعد کسی کو بھی اجازت نہ دی جائے اس پر آپ نے فرمایا۔ہمیں ہوسٹل کو ہوسٹل ہی رکھنا چاہیئے۔جیل نہیں بنانی چاہیئے۔ پھر فرمایا کہ یہ طلباء چند سال ہمارے مہمان کے طور پر ہمارے پاس رہتے ہیں۔اور پھر ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائیں گے۔بہتر یہ ہے کہ جب وہ یہاں سے جائیں تو وہ ان چند سالوں کو اپنی زندگی کی خوشگوار یادیں تصور کریں اور ہمارے کالج کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔

آپ طلباء کے ہر دلعزیز استاد تھے۔فلسفہ کے علاوہ انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔نیز کالج کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔کالج کی کشتی رانی کی ٹیم کے انچارج رہے پھر باسکٹ بال کی ٹیم کے بھی انچارج تھے۔باسکٹ کی ٹیم سارے پاکستان میں مشہور تھی آپ کی محنت سے تعلیم الاسلام کالج کے باسکٹ بال کے اکثر کھلاڑی پاکستان کی نیشنل ٹیم میں شامل ہوئے۔ملک کے سارے کالجوں میں تعلیم الاسلام کی ٹیم کا شہری تھا۔یہ سب کامیابیاں آپ کی انتھک محنت کا نتیجہ تھیں۔

غیر از جماعت طلباء سے آپ کی خاص شفقت

تعلیم الاسلام کالج کے ہوسٹل میں اکثر50٪ طلباء غیر از جماعت ہوا کرتے تھے۔مختلف شہروں اور دیہاتوں سے آکر داخلہ لیتے۔آپ ان کے حالات سے آگاہ رہتے۔ان میں سے بعض طلباء امیر زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔لیکن آپ کا سلوک سب سے یکساں ہوتا تھا۔آپ کی شفقت سے کوئی محروم نہیں رہتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ جب وہ طلباء کالج سے فارغ ہو کر گئے تو ان شفقتوں اور محبتوں کی انمٹ یادوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔اور جب بھی کبھی ان سے سر راہ ملاقات ہو جاتی تو وہ کالج کے بیٹے ہوئے خوشگوار دنوں کا ذکر کرتے۔اور خاص طور پر چوہدری محمد علی صاحب کے حسن سلوک کا تذکرہ کرتے۔اور کہتے کہ ہمارے والدین نے ہمیں چار سال کیلئے کالج کے سپرد کیا تھا اور چوہدری صاحب نے باپ بن کر ہمارا خیال رکھا جو ہم زندگی بھر نہیں بھول سکیں گے۔

جو کام بھی آپ کے سپرد کیا گیا پوری لگن کے ساتھ آپ نے سرانجام دیا۔نیز آپ نے اپنی جان، اپنا علم، اپنی محبت، اپنا ایثار، اپنی آرزوئوں کو جماعت کے حضور پیش کر دیا۔اور اپنی گردن کو خلفاء کی اطاعت میں جھکا دیا اور ایسی وفا کی کہ اس میں ذرہ بھر بھی لغزش نہ دی۔آپ کا اپنا شعر ان کے جذبات کی عماضی کرتا ہے۔

کیوں غرض درمیاں میں آئے
جب کسی سے وفا کرے کوئی

آپ کے وہ کام جو آپ نے 71 سال کی مدت تک سرانجام دیئے جو لا تعداد ہیں جن کو یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔مجھے اُمید ہے کہ جب مورخ احمدیت ان کو رقم کرے گا تو اس نابغہ روزگار کا اس طور سے ذکر کرے گا کہ آنے والی نسلیں ان سے سبق سیکھیں گی۔

آپ کا خدا تعالیٰ سے عشق

صرف میں ہی نہیں بلکہ آپ کے ملنے والے دوستوں نے دیکھا ہوگا کہ چوہدری صاحب کا دل خدا تعالیٰ کی محبت میں کتنا رقیق تھا۔ خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے ہی آپ کی آنکھوں کو نم بلکہ اشکبار ہوتے دیکھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے سارے وجود پر اثر انداز ہوتے دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا گیا کہ آپ کسی بات پر فرط مسرت میں ہنس رہے ہیں۔ لیکن جونہی وہ ماحول خدا اور اس کے رسول کے ذکر میں تبدیلی ہوا وہ آنکھیں اسی لمحے اشکبار ہو جاتی تھیں۔ خدا تعالیٰ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں پنہاں تھی۔ خدا تعالیٰ کی محبت اور اس تعلق کو بڑے دلکش اور حسین پیرائے میں اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے۔

اتنا تو ہو کہ اس کی ملاقات کے لئے
سینہ ہو دُھلا ہوا اور آنکھ تر بھی ہو

رات بھر ہوتیں ہیں دل کھول کر دل کی باتیں
ایک میں ہوتا ہوں اک میرا خدا ہوتا ہے

اس کو چاہوں اس کی سوچوں اس کی کرتا رہوں ملاقات
جو اذن لکھنے کا پاسکوں تو اسی کو میں بے حساب لکھوں

ہاتھ جب بھی اٹھائے دعا کے لئے
ایک میں، ایک میرا خدا رہ گیا

اے جتنے تھے آسرے ٹوٹے
ایک تیرا نہ آسرا ٹوٹا

زہے نصیب کہ اب خیمہ زن ہے پلکوں پر
وہ ایک اشک جو ماں کی دعائوں جیسا ہے

سر مژہ جو لرز رہے ہیں درود و نعت کے ستارے
انہیں شفاعت کے پھول لکھوں کہ مغفرت کے گلاب لکھوں

میرا وجود اس کے تصور میں کھو گیا
وہ خود اگر نہ سامنے آیا تو کیا ہوا

یہ کس کا عکس اتر آیا تھا رگ جاں میں
کہ لاکھ پردوں میں چھپ کر بھی آشکارا تھا

تیرے ہوتے ہوئے کس کے کہلائے
اک یہی بات عمر بھی نہیں ہوئی

تو ہی تھا وہ سوال جو اکثر کیا گیا
تو ہی تھا وہ جواب کہ لاجواب تھا

قارئین! یہ بات درست ہے کہ خوب سے خوب تر کا درجہ ہمیشہ خالی ہوتا ہے۔ جس کو پانے کے لئے اہل قلم وہاں تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں اور وہ اس بات سے نہیں جھجکتے کہ اس بقاء دوام کے دربار میں ان سے پہلے بھی ہیں۔ چوہدری محمد علی صاحب نے اس خیال کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

کرسیاں کتنی ہی خالی تھی سر بزم سخن

یوں تو غالب بھی تھا، اقبال بھی تھا میر بھی تھا

بزم سخن کے آپ روح رواں تھا۔ بزم ادب کی آپ شان تھے۔ آپ کی جدائی سے بزم سخن سونی ہو گئی ہے۔ نگاہیں انہیں ڈھونڈیں گی۔ آپ کو پا نہ سکیں گی۔ صرف آپ کی یادیں رہ جائیں گی۔ ان کی یادوں میں سے ان کی ایک یاد وہ مشاعرے ہیں۔ جن میں شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ انمنٹ نقش ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ان مشاعروں میں سے تعلیم الاسلام کالج کے بین الکلیاتی Debate جو ہر سال ہوا کرتی تھی اس کے بعد مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں پاکستان کے مشہور شاعر مدعو کئے جاتے تھے اس مشاعرے کا انتظار اہل ربوہ کو ہوتا۔ جس میں مستورات کے لئے بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں میں چوہدری محمد علی صاحب کا کلام بڑے اشتیاق سے سنا جاتا تھا۔ اور یہ سلسلہ کئی سالوں سے چلتا رہا۔ جب بھی آپ اپنا کلام سنانے کے لئے ڈائس پر آتے اور اپنی نوٹ بک کھولنے لگتے۔ تو ہال سے طلباء کی آوازیں آنے لگتیں۔ تنہائی۔ تنہائی۔ اور یہ فرمائش طلباء ہر سال کرتے تھے آپ نے دیکھا ہو گا پاکستان کے مشہور شاعر انور مسعود صاحب بھی مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کے لئے آتے ہیں تو سامعین شور مچا دیتے ہیں کہ بنیان! بنیان۔ حالانکہ ان کو سینکڑوں مرتبہ وہ سنا چکے ہوتے ہیں۔ بعض نظمیں شاعروں کی ماسٹر پیس بن جاتی ہیں لہٰذا چوہدری محمد علی صاحب کی تنہائی والی نظم ان کی یاد میں درج کرتا ہوں۔ وہ لوگ جنہوں نے اگر پہلے نہیں سنی اس نظم سے محظوظ ہوں۔ اور جنہوں نے پہلے سنی ہوئی ہے۔ اس انداز سے پڑھیں کہ اس نظم سے ان کی یاد جڑی ہوئی ہے۔

دیدہ و دل تنہائی میں گھول رہے ہیں درد کے او قیانوس
مجبوروں کے ایشیا اور مزدوروں کے روس
تنہائی میں جل اٹھے ہیں یادوں کے فانوس
یاد کی جوت جگائی
تنہائی تنہائی

بنجر ٹیلوں می اُگ آئے خواہش کے شہتوت
حال کے گلشن میں لا رکھا ماضی کا تابوت
بزم طرب میں ڈرتے ڈرتے آیا ایک اچھوت
کیوں ڈرتے ہو بھائی
تنہائی تنہائی

پت جھڑ کے طوفاں میں پیلے پتے ہیں مجبور
وقت کا سینہ کھود رہے ہیں لمحوں کے مزدور
تناہی میں چاند نے چوسے اشکوں کے انگور
آگ سے آگ بجھائی
تنہائی تنہائی

دھیان کی ٹہنی ٹہنی پر رقصاں ہیں من کے مور
لفظوں کے دروازے توڑ رہے ہیں گونگے چور
آگ سے آگ بجھائی
تنہائی تنہائی

دھیان کی ٹہنی ٹہنی پر رقصاں ہیں من کے مور
لفظوں کے دروازے توڑ رہے ہیں گونگے چور
دشت کے سینے میں برپا ہے تنہائی کا شور
قیس نے ٹھوکر کھائی

تنہائی تنہائی

شعر کے گورے گال پہ نکلا تنہائی کا تل
لفظوں کے درویش کھڑے ہیں اُٹھ عزت سے مل
یاد کی گت پر ناچ رہے ہیں دروازوں کے دل
چیختی ہے شنہائی
تنہائی تنہائی

کوٹھوں پریوں سیر کو نکلی ہے کسی آشنائیں
نچلی منزل والوں کو کہہ دو وہ اوپر مت آئیں
تھک جائیں تو بھیگی آنکھوں سے تلوے سہلائیں
گھورتی سے گہرائی
تنہائی تنہائی

روما کی دیواروں سے رستی ہے خون کی مئے
سیزر کو جب مار چکو تو بولو سیزر کی جئے
مصر کے مردہ خانوں میں اک ممی بول رہی تھی
ہنستا ہے سودائی
تنہائی تنہائی

وقت کی نیلی جھیل میں اُٹھا لہوں کا طوفان
انسانوں سے آن ملیں گے پھر واپس انسان
صحرا کے سینے میں جاگے آس کے نخلستان
دشت میں آندھی آئی
تنہائی تنہائی

یہ کس کی تصویر کو جھک کر چوم رہے ہیں چاند
نید کی نیا ڈول رہی ہے جھوم رہے ہیں چاند
پانی کے پردیس میں تنہا گھوم رہے ہیں چاند
پار پون لہرائی
تنہائی تنہائی

چوہدری محمد علی صاحب کو جماعت کے مختلف کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن آپ کی زندگی کے آخری سالوں میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعض کتب کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی جو توفیق عطا فرمائی۔ یہ ایسی سعادت ہے جس کا اجر رہتی دنیا تک آپ کو ملتا رہے گا۔ جو بھی انگریزی زبان میں وہ کتب پڑھے گا۔ آپ کو بھی دعائیں دے گا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پیغام ان تک پہنچانے میں آپ نے بھی حصہ لیا ہے۔ جب آپ کی ملاقات حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ہو گی تو وہ اپنے اس خادم کو گلے لگا لیں گے۔ آپ کا انجام بخیر ہوا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں اپنی خواہشوں کو قربان کرتے ہوئے 71 سال کام کرنے کے بعد کامیاب و کامران ہو کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔ ان کی روح خدا کے حضور کہہ رہی ہو گی۔

ہم سے دیوانے کہیں ترک وفا کرتے ہیں
جان جائے کہ رہے بات نباہ دیتے ہیں

☆☆☆☆☆

بشکریہ روزنامہ الفضل ربوہ۔ ستمبر ۲۰۱۵ء

استاذی المکرم چوہدری محمد علی صاحب کی یاد میں

محمد داؤد طاہر

میں نے 1961ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں داخلہ لیا جہاں سے میں نے 1963ء میں انٹر میڈیٹ اور 1965ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ان چار سالوں کے دوران مجھے بہت سے اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔

چوہدری محمد علی ہمیں فرسٹ ایئر میں منطق پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ بالکل غیر رسمی تھا۔ ممکن ہے وہ اس عرصے میں دو چار بار کلاس روم میں بھی آئے ہوں لیکن بالعموم وہ ہمیں اپنے گھر پر بلا لیا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ موصوف فضلِ عمر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے اور اس حوالے سے انہیں کالج کیمپس میں مکان ملا ہوا تھا۔ ہم میں سے کچھ ان کے ساتھ چارپائی پر اور باقی سامنے پڑی کرسیوں اور موڑھوں پر بیٹھ کر ان کے گرد دائرہ سا بنا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لہجے میں ایک خاص مٹھاس رکھی تھی اور واقعات کے بیان کا ملکہ عطا فرمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے خوبصوت لہجے میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے اور باتوں ہی باتوں میں پڑھاتے بھی جاتے۔ بعض اوقات وہ ہمیں کچھ کھلا پلا بھی دیتے۔ یہ ان کی شفقت ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم شوق سے ان کے پیریڈ کا انتظار کرتے اور بغیر کسی اشد مجبوری کے اسے کبھی مِس نہ کرتے۔

ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ ہونے کے علاوہ وہ بیک وقت کالج کے ہائیکنگ کلب، کشتی رانی کلب اور باسکٹ بال کلب کے صدر بھی تھے۔ اس اعتبار سے ان کے فرائض بہت متنوع تھے لیکن وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کرتے۔

وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجھے ''مقابلے کے امتحان'' میں بیٹھنے کی طرف توجہ دلائی۔ چوہدری صاحب بتایا کرتے تھے کہ اس امتحان میں کامیابی کے لئے انگریزی زبان پر دسترس بہت ضروری ہے اور اس صلاحیت کا اظہار نہ صرف اُمیدوار کی تحریر بلکہ اس کی بول چال سے بھی ہونا چاہیے۔

چوہدری محمد علی کے ساتھ شاگردی کا باقاعدہ تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا جس کی وجہ سے بعد میں ان کے ساتھ ملاقات کم ہوگئی۔ ہاں! وہ جہاں ملتے بالعموم مقابلے کے امتحان کی تیاری کی یاددہانی کراتے رہتے۔

وہ میرے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ اباجی کے دوستوں میں سے تھے اور اس حوالے سے بھی مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ غالباً 1967ء میں وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ساتھ دورۂ یورپ سے واپس آئے ہی تھے کہ ان سے گول بازار میں ملاقات ہوگئی۔ بہت محبت سے ملے اور دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا۔

1982ء یا 1983ء میں جب میں پشاور میں تعینات تھا، چوہدری محمد علی صاحب اپنے کسی کام سے وہاں آئے اور ازراہِ مہربانی مجھے بھی اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ان کا قیام تو کسی اور جگہ تھا لیکن میری دعوت پر وہ ایک سے زیادہ بار غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کی واپسی کا وقت آیا تو میں انہیں الوداع کہنے کے لئے پشاور کینٹ ریلوے سٹیشن پر گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ تیزابیت کے مریض ہیں اور ممکن ہے انہیں دورانِ سفر دودھ کی ضرورت پیش آجائے لہٰذا میں ان سے اجازت لے کر دودھ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن پلیٹ فارم پر دودھ مل نہ سکا۔ مجبوراً میں سٹیشن سے باہر نکلا اور دودھ کے ایک دو پیکٹ لے کر واپس لوٹا لیکن اس عرصے میں ان کی ٹرین نکل چکی تھی۔ میرے علم میں تھا کہ یہ ٹرین کینٹ ریلوے سٹیشن سے چل کر پشاور سٹی ریلوے سٹیشن پر جا رُکتی ہے۔ چنانچہ میں اپنی کار میں سٹی ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ خوش قسمتی سے ٹرین ابھی وہاں کھڑی تھی۔ خدا کا شکر ہے میں انہیں دودھ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ چوہدری صاحب نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں اور ربوہ پہنچ کر مجھے ایک خط لکھا جس میں بے حد ممنونیت کا اظہار کیا گیا تھا۔

چوہدری محمد علی صاحب انتہائی بے نفس اور نیک خُو انسان تھے۔ میرے دوست رفیق محمد خان طاہر صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک بار چوہدری محمد علی صاحب ہوسٹل کے معمول کے رائونڈ پر تھے۔ انہوں نے ان کو اور ان کے بھائی لئیق کو دیکھا تو ہدایت کی کہ وہ کسی وقت علیحدگی میں ان سے مل لیں۔ اگلے روز وہ ان کے دفتر میں گئے تو موصوف مصروف تھے چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو پھر کسی وقت آنے کو کہا۔ وہ چوہدری محمد علی صاحب کے پاس دوبارہ حاضر ہوئے تو انہوں نے بتایا۔ ”میں نے خواب میں لئیق کے چہرے پر غم واندوہ کے آثار دیکھے ہیں لہٰذا آپ دونوں کچھ صدقہ کر دیں، میں بھی کردوں گا۔“ رفیق کہتے ہیں۔ ”اس وقت تو ہم چوہدری صاحب کی بات سمجھ نہ سکے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جب ہماری والدہ اچانک اللہ کو پیاری ہوگئیں تو ہمیں اندازہ ہوا کہ انہوں نے ہمارے بارے میں یقینا منذر خواب دیکھا تھا لیکن احتیاطاً ہمیں پورا خواب سنانے کی بجائے انہوں نے صرف صدقہ دینے کے مشورے پر اکتفا کیا۔“

رفیق صاحب بیان کرتے ہیں۔ ”چوہدری صاحب کی ایک خوبی جس سے میں بہت متاثر ہوں طلبہ کی تربیت سے تعلق رکھتی ہے۔ جب میں اور لئیق کالج میں داخلے کے لئے ربوہ آئے تو انہوں نے اباجان سے وعدہ لیا کہ وہ ہمارے اخراجات کے لئے رقم براہِ راست ہمیں بھیجنے کی بجائے ان کی معرفت بھجوایا کریں گے۔ اس وقت ہم ان کے اس فرمان کی حکمت نہ سمجھ سکے لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ اس پابندی نے ہمیں ضروری اور غیر ضروری اخراجات میں تمیز سکھادی۔ ہم چوہدری صاحب کے اس اطمینان کے بعد ہی مطلوبہ رقم حاصل کر سکتے تھے کہ ہماری ضرورت حقیقی ہے۔ ہم نے چوہدری

صاحب کے اس اقدام کا ثمر عمر بھر کھایا اور ہمیں فضول خرچی سے اجتناب کی عادت ہو گئی۔"

ایک بار میں کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد چوہدری صاحب سے ملا۔ وہ ایک لمبی بیماری کے بعد ان ہی دنوں دفتر واپس آئے تھے مگر میری خوش نصیبی کہ انہوں نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا، مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بیٹھے بیٹھے مجھے گلے لگا لیا۔ وہ بار بار معذرت کر رہے تھے کہ اپنی صحت کی کمزوری کے سبب وہ اٹھ کر مجھے خوش آمدید نہیں کہہ سکے۔

مجھ سے پہلے ان کے پاس دفتر کے کوئی کارکن بیٹھے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے چوہدری صاحب سے اجازت طلب کی اور میں ان کی خالی کی ہوئی کرسی پر چوہدری صاحب کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے ان کی صحت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے برجستہ فرمایا۔ "I am alive although not kicking" جس کا مفہوم یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں زندگی تو دے رکھی ہے لیکن وہ کئی طرح کے عوارض کا شکار رہتے ہیں۔

اُس روز چوہدری صاحب گفتگو کے موڈ میں تھے اور اپنی زندگی کے واقعات سناتے چلے جا رہے تھے۔ میں تقریباً دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھا ہوں گا۔

ان کے ساتھ متعدد ملاقاتوں کے دوران بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان کے سکول کی باتیں، موگا کالج کی کہانیاں، گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے قصے، ان کے قبول احمدیت کی داستان، تعلیم الاسلام کالج قادیان میں ملازمت کے واقعات، ہجرت کے مسائل، حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی نوازشوں، قاضی محمد اسلم سابق صدر شعبۂ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی شفقتوں، بعض غیر از جماعت دوستوں کی مہربانیوں، احمدی دوستوں کی کرم نوازیوں، غرض چوہدری صاحب نے بے شمار مضوعات پر لب کشائی کی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چوہدری صاحب اسی میٹھے اور دھیمے لہجے میں باتیں کرتے چلے جائیں اور میں سنتا جاؤں لیکن زندگی کے حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں۔ مجھے اسی روز لاہور واپس آنا ہوتا تھا۔

آپ بتاتے تھے۔ "ہم لوگ مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں، مسیتاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے میٹرک جے ایم ڈی بی ہائی سکول، زیرہ سے کیا جہاں مجھے سید رضا حیدر زیدی سے فارسی پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ عقیدۃً شیعہ تھے اور فارسی پر خاصی گرفت رکھتے تھے۔ اتفاق سے انٹرمیڈیٹ میں بھی ہمارے فارسی کے استاد ایک شیعہ ہی تھے۔

چوہدری صاحب نے بتایا کہ "بی اے کے سالانہ امتحان میں میرا پہلا پرچہ انگریزی کا تھا۔ میں بدقسمتی سے کمرۂ امتحان میں قدرے تاخیر سے پہنچا۔ اس وقت تک امتحانی کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری کاپی پر کسی اور طالب علم نے اپنا رول نمبر لکھ رکھا ہے اور یہ سیاہی سے لتھڑی پڑی ہے۔ میں اس کاپی پر اپنا پرچہ کیوں کر حل کر سکتا تھا چنانچہ میں نے مطالبہ کیا کہ اسے تبدیل کیا جائے۔ اس امتحان کے لئے لاہو کے کوئی پروفیسر سپرنٹنڈنٹ بن کر آئے ہوئے تھے اور تھاپر صاحب ان کے ڈپٹی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ مجھے کھڑا دیکھ کر تھاپر صاحب قریب آئے اور میری بات سن کر فرمانے لگے۔ "I am sorry you can`t change it" جب وہ اپنے اس فیصلے کی کوئی معقول وجہ نہ بیان کر سکے تو میں نے گزارش کی کہ If you can`t change

it, I will not take te exam. جب اردگرد بیٹھے ہوئے طلبہ کو اندازہ ہوا کہ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو ان میں سے بعض میری حمایت میں اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے جس پر سپرنٹنڈنٹ سٹیج سے اُتر کر خود میرے پاس آ گئے۔ بحث تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ مجھے نئی کاپی فراہم تو کر دی جائے گی لیکن اس بے ساتھ سیاہی سے لتھڑی ہوئی کاپی منسلک کر کے پورا واقعہ یونیورسٹی کو لکھ بھیجا جائے گا۔ اس جھگڑے میں میرا بہت سا وقت ضائع ہو گیا۔ میں غصے سے پیچو تاب کھا رہا تھا لیکن کر کچھ نہ سکتا تھا چنانچہ قہر درویش بر جانِ درویش کے مصداق میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ امتحان نہیں دوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہاف ٹائم ختم ہونے کے اعلان کے ساتھ ہی پرچہ امتحانی سٹاف کے حوالے کر کے کمرہ امتحان سے باہر آ گیا۔“

”اُس وقت ہاروے صاحب شہر سے باہر گئے ہوئے تھے“ چوہدری صاحب نے بتایا ”وہ شام کو واپس آئے اور انہیں اس واقعہ کی خبر ملی تو مجھے اپنے پاس طلب کرنے کی بجائے خود میرے کمرے میں تشریف لے آئے۔ اس زمانے میں ہوسٹل پریفلیکٹ کا کمرہ بہت پُر آسائش ہوتا تھا۔ وہ آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور مجھ سے پورا واقعہ سنا۔ انہوں نے حکماً کہا کہ مجھے امتحان چھوڑنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے، رہے تھاپر صاحب تو وہ خود انہیں سمجھا دیں گے۔ میرے کانوں میں اب بھی ان کے الفاظ گونج رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "You must continue. I will inform Thopper that if he does the same again he will be transferred." میں نے امتحان تو دے دیا لیکن میری انگریزی میں آنرز کرنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ شاید قدرت نے میرے لئے یہی مقدر کر رکھا تھا۔“

اس کے بعد آپ کا تھاپر صاحب سے آمنا سامنا نہیں ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔ ”ہوا۔ وہ بھی عجیب کہانی ہے۔ میں اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں تھا اور اپنے کسی کام سے انارکلی سے گزر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی آدمی میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے اور جب میں آہستہ ہوتا ہوں تو وہ بھی آہستہ چلنے لگتا ہے اور جب میں تیز چلنے لگتا ہوں تو وہ بھی تیز قدم ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں اس نے مجھے آ لیا۔ وہ تھاپر صاحب تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور پوچھنے لگے "Are you still angry withme?" داؤد صاحب! کچھ نہ پوچھیں اس وقت میرا کیا حال ہوا۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور میں نے کہا۔ No, Sir. I can`t even think of it. You have always been very kind to me." میں نے دیکھا تھاپر صاحب بھی جذباتی ہو رہے تھے۔“

چوہدری محمد علی صاحب نے ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور یہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں احمدیت کی نعمت سے متمتع ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ وہ بتاتے تھے۔ ”اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ انگریزی میں آنرز کرنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی تو میں فلاسفی کی طرف آ گیا۔ جب میں ایم اے میں داخلے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور پہنچا تو قاضی محمد اسلم صاحب اس شعبہ کے سربراہ تھے۔ قاضی صاحب بادی النظر میں تو اس دور کے باقی اساتذہ کی طرح بڑے سمارٹ اور خوش لباس تھے لیکن ان میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جو انہیں باقی اساتذہ سے ممتاز کرتی تھی۔ میں احمدیت سے متاثر تو پہلے ہی تھا اور ایک بار قادیان بھی جا چکا تھا لیکن اس وقت تک

میں حلقہ بگوش احمدیت نہ ہوا تھا۔ مجھے قاضی صاحب میں ایک مثالی استاد بلکہ مثالی انسان کی جھلک تو پہلے ہی نظر آتی تھی لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ احمدی ہیں تو میں شعوری طور پر ان کے زیادہ قریب ہو گیا اور میں نے 1941ء کے جلسہ سالانہ پر باقاعدہ طور پر احمدیت قبول کر لی۔"

چوہدری محمد علی صاحب تعلیم الاسلام کالج کے ابتدائی اساتذہ میں سے تھے اور اس لحاظ سے وہ کالج کی تاریخ سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ بتاتے تھے۔ "قادیان میں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو مجھے سوئمنگ پول کا انچارج بنایا گیا۔ میں نے لڑکوں کو ساتھ لگا کر پول کی بہت اچھی طرح صفائی کرائی اور اس میں تازہ پانی بھرا۔ ہم نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے درخواست کی کہ وہ اس میں غسل کر کے پول کا افتتاح فرمائیں لیکن جب کئی دنوں تک اس کا جواب موصول نہ ہوا تو میں نے صورت حال جاننے کے لئے دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں فون کیا۔ ٹیلیفون غیر متوقع طور پر حضور نے خود اٹھا لیا۔ سچ پوچھیں تو میں گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ میں ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ خیر میں نے ہمت کر کے اسے اٹھایا تو حضور نے ہولڈ کیا ہوا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں حضور کے سامنے اپنی درخواست دہرائی تو آپ نے جواباً فرمایا۔ "آپ کا خط مل گیا تھا لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ سوئمنگ پول کا افتتاح تو بہت پہلے ہو چکا ہے، کیا اس کے دوبارہ افتتاح کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کی کہ ہم نے اس پول کو بہت اچھے طریقے سے صاف کیا ہے اور اس میں نئے سرے سے پانی بھرا ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس میں غسل کر کے اس کا افتتاح فرمائیں۔ اس پر حضور نے فرمایا۔ میں تو نقرس کا مریض ہوں اور میرے لئے تالاب میں نہانا ممکن نہیں لہٰذا آپ دوبارہ افتتاح کے بغیر ہی اس کا استعمال شروع کر دیں۔ یہاں یہ پول لڑکوں کے استعمال میں آنے لگا۔"

ہجرت کے بعد لاہور میں تعلیم الاسلام کالج کے قیام کے حوالے سے چوہدری محمد علی صاحب نے اپنی ایک گفتگو میں بتایا۔ "جب میں قادیان سے رخصت ہو رہا تھا تو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد (خلیفۃ المسیح الثالثؒ) نے ارشاد فرمایا کہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو آپ کا یہ پیغام پہنچا دوں کہ لاہور میں تعلیم الاسلام کالج کے قیام کے حوالے سے جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ میرے لاہور پہنچتے ہی کالج کمیٹی کی میٹنگ آ گئی۔ اس کمیٹی کے سربراہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد اور اراکین حضرت مولانا عبدالرحیم درد اور حضرت ملک غلام فرید تھے۔ حضور اس میٹنگ کی صدارت فرما رہے تھے اور فیصلہ یہ کیا جانا مقصود تھا کہ کالج کہاں اور کب شروع کیا جائے۔ چونکہ میں اس میٹنگ میں ایک طرح سے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی نمائندگی کر رہا تھا لہٰذا میں نے حضور تک آپ کا یہ پیغام پہنچا دیا کہ کالج کا فوری طور پر آغاز قرین مصلحت نہ ہو گا۔ اس پر حضور نے باری باری دونوں اراکین کمیٹی سے رائے طلب کی۔ انہوں نے بھی کالج کے قیام کو مؤخر کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر حضور نے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔ "رائے تو میری بھی یہی ہے۔" اس پر حضور جلال میں آ گئے اور آپ نے قدرے اونچی آواز میں فرمایا۔ "ہم اپنے نوجوانوں کے ساتھ ظلم نہیں کر سکتے۔ کالج شروع ہو گا، آج ہی سے اور ابھی۔"

حضور کے اس ارشاد کے بعد کالج کمیٹی کے لئے چوں وچرا کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی چنانچہ میٹنگ برخاست ہوتے ہی ہم نے لوہے کے ایک ٹوٹے پھوٹے بورڈ کا انتظام کیا اور اس پر ایک پینٹر سے جلی

حروف میں ”تعلیم الاسلام کالج لاہور“ کے الفاظ لکھوائے۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ کالج قائم کہاں ہو؟ اس وقت سیمنٹ بلڈنگ میں بہت سے خاندان مقیم تھے۔ ہم نے گراؤنڈ فلور پر بمشکل ایک کمرہ خالی کرایا، وہاں ایک میز کرسی رکھی اور جنید ہاشمی کو اس پر بٹھا دیا۔ اس کمرے کے باہر تعلیم الاسلام کالج لاہور کا بورڈ لگا دیا گیا۔ یہ تھا لاہور میں اس کالج کا پہلا دن۔“

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اختلاف عقائد کے باوجود مولوی محمد علی کے ساتھ عزت اور محبت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت مولوی صاحب اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ڈلہوزی میں مقیم تھے۔ حضور نے ان کی پاکستان بحفاظت منتقلی کا انتظام فرمایا۔ چوہدری صاحب بتاتے ہیں۔ ”ایک بار جب میں رتن باغ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے دور سے ایک شخص کو وہاں سے نکلتے دیکھا۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ یہ مولوی محمد علی ہیں تاہم ان کے جماعت کے ساتھ اختلافات کے پیش نظر مجھے اپنے آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں رتن باغ پہنچا تو حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا کچھ دیر پہلے مولوی محمد علی یہاں آئے ہوئے تھے۔ آپ نے تصدیق کی کہ وہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی پاکستان منتقلی کے حوالے سے حضرت صاحب کے تعاون پر آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئے تھے۔“

چوہدری صاحب ایک طویل عرصہ تک تعلیم الاسلام کالج کی روئنگ ٹیم کے انچارج رہے ہیں۔ موصوف ایک لمبا عرصہ فضل عمر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔ وہ بتاتے تھے۔ ”ہم میس کے لئے کھانے پینے کا جملہ سامان خوب چھان پھٹک کر خریدتے تھے جس کی وجہ سے ہوسٹل کا کھانا نہ صرف اچھا بلکہ دیگر کالجوں کے ہوسٹلوں سے سستا بھی ہوتا۔ زمانہ لاہور میں جب یہ خبر پھیلی تو گورنمنٹ کالج کے بعض طلبہ جو ہمارے کچھ بورڈرز کے دوست تھے ہمارے یہاں آ کر کھانا کھانے لگے۔ جب وہ واپس جا کر اپنے ساتھیوں کے سامنے ہمارے کھانے کی کوالٹی اور ارزانی کی تعریف کرتے تو ان کے دل میں اپنی انتظامیہ کے خلاف شکایت پیدا ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ بات ان کے پرنسپل، پروفیسر سراج تک جا پہنچی۔ انہوں نے پیغام بھیجا کہ وہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ پروفیسر سراج کے شاگرد رہے تھے چنانچہ آپ نے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ ملاقات ہوئی تو دیگر باتوں کے علاوہ پروفیسر سراج نے شکوۃً یہ بات بھی کہی جس کے بعد ہمارے ہوسٹل کی طرف سے بیرونی کالجوں کے طلبہ کے کھانے پر پابندی لگا دی گئی۔ میرا قیاس ہے کہ گورنمنٹ کالج کے لڑکوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے پروفیسر سراج کو جتلایا کہ انہیں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی جس کے نتیجے میں ان کے میس کے دروازے ہم پر بند کر دیئے گئے ہیں۔ میری اپنی رائے ہے کہ پروفیسر سراج اپنے طلبہ کا دباؤ برداشت نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے پھر حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو پیغام بھجوایا کہ ممکن ہو تو وہ یہ پابندی ختم کر دیں۔ اس پر آپ نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ ہوسٹل ہے، ہوٹل نہیں کہ جس کا جی چاہے بل ادا کر کے روٹی کھاتا رہے اور یہ پابندی عمومی طور پر برقرار رہی۔“

بطور ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ بعض دفعہ ہمیں عجیب و غریب صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا“ چوہدری صاحب کی گفتگو جاری تھی ”ایک زمانے میں ہم اگلی دوپہر کے لئے سالن رات کے وقت ہی پکا لیا کرتے

تھے۔ ایک بار محسوس کیا گیا کہ رات کے وقت کسی نے کچھ سالن نکال لیا ہے لیکن اس بات پر زیادہ دھیان نہ دیا گیا تاہم جب یہی شکایت روزروز ہونے لگی تو ہم نے اپنے لڑکوں کی ایک خصوصی ٹیم تیار کی۔ یہ لڑکے عشاء کی نماز کے بعد طلبہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے لگے۔ جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ اس شرارت میں کون کون سے طلبہ ملوث ہیں۔ وہ کچن میں سے سالن چرا کر اپنے کمرے میں لے جاتے اور حسب ضرورت رات کے کسی پہر اس سے لطف اندوز ہوتے۔ ایک رات جب وہ لڑکے سالن اپنے کمرے میں لے جا چکے تھے میں نے انہیں جالیا۔ انہوں نے اپنی طرف سے سالن کی پلیٹیں چارپائی کے نیچے چھپا رکھی تھیں۔ لیکن حسن اتفاق سے کمرے میں داخل ہوتے ہی میری ان پر نظر پڑ گئی۔ میں چاہتا تو جاتے ہی جتلا سکتا تھا کہ میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں حتیٰ کہ نصف شب بیت گئی۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا لہٰذا ان کو شک پڑ گیا کہ ان کی یہ حرکت انتظامیہ کے نوٹس میں آچکی ہے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے لہٰذا میں ان سے اس موضوع پر کوئی بات کئے بغیر واپس آگیا۔ ان کے مخالف گروپ کو پتا چلا کہ میں نے سالن چوروں سے کوئی باز پرس نہیں کی تو ان کی طرف سے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو تحریراً شکایت کی گئی کہ میں ان چوروں سے ملا ہوا ہوں۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے مجھ سے اس شکایت کا ذکر کیا تو میں نے سارا معاملہ ان کے گوش گزار کر دیا اور بتا دیا کہ ان لڑکوں نے کسی ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر ہی کھانے کی چوری بند کر دی ہے لہٰذا میں ان کی جواب طلبی یا ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے میری اپروچ سے اتفاق کیا اور یوں یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔"

چوہدری صاحب بتاتے ہیں۔ "تعلیم الاسلام کالج میں ملازمت ایک تنے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف تھی۔ لوگ چھوٹی چھوٹی باتیں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو شکایت کی صورت میں پہنچاتے رہتے تھے اور جب ایسی کوئی بات حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے علم میں آتی تو کہا کرتے۔ چوہدری صاحب! مصلے پکڑ لو اور میں سمجھ جاتا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

1965ء کی جنگ کے حوالے سے بات شروع ہوئی تو چوہدری صاحب نے بتایا۔ "اس جنگ کے دوران دشمن کے طیارے ربوہ کی فضا سے گزر کر سرگودھا کی طرف جاتے تھے۔ سنتے تھے کہ ایک بار واپس جاتے ہوئے کسی طیارے نے ربوہ کے نواح میں اپنی پٹرول کی ٹینکی گرادی ہے اور ایک بار قریب ہی کسی جگہ سٹریفنگ ہوئی یعنی جہاز کے ذریعہ مشین گن سے گولیاں برسائی گئیں۔ میری اور حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی دیوار سانجھی تھی۔ جب کوئی جہاز گزرتا آپ مجھے ضرور آواز دیتے اور بعض دفعہ آتے جاتے جہازوں کو دیکھا کرتے۔ ان ہی دنوں آپ نے مجھے ہدایت کی کہ میں کالج کے کچھ دلیر طلبہ کا انتخاب کروں اور انہیں ہتھیاروں کے استعمال کی بنیادی تربیت دینے کے بعد کالج اور قصر خلافت میں ڈیوٹی کیلئے تیار کروں۔ مجھے یاد ہے ہم نے کچھ طلبہ کو اس مقصد کے لئے تیار کیا اور ان کی ضروری ٹریننگ کرائی۔ یہ طلبہ جنگ کے دنوں میں اور جنگ کے کچھ عرصہ بعد تک مندرجہ بالا دونوں مقامات پر ڈیوٹی دیتے رہے۔"

میرے زمانہ طالب علمی تک حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے پاس سیاہ رنگ کی ایک وُلزلے کار ہوا کرتی تھی جس میں وہ اور ان کے

اہل خاندان اِدھر اُدھر آتے جاتے تھے۔ اس کار کو آپ خود بھی ڈرائیو کر لیتے تھے لیکن اکثر اوقات محمد احمد حیدر آبادی اسے چلا رہے ہوتے تھے۔ اکثر طلباء کا خیال تھا کہ یہ کار کالج کی پراپرٹی ہے جسے آپ بطور پرنسپل اپنے ذاتی مصرف میں لاتے ہیں تاہم چوہدری محمد علی نے ہماری یہ غلط فہمی دور کر دی اور بتایا کہ یہ کار آپ کی اپنی ملکیت ہے۔

یہ کار پرانی تھی اور چلتے ہوئے اس میں سے بہت آوازیں آتی تھیں۔ چوہدری صاحب بتاتے ہیں۔ "کالج کے ایک متمول طالب علم نے جس کے پاس اس زمانے کے لحاظ سے ایک بہتر کار موجود تھی اور وہ اسی پر کالج آیا جایا کرتا تھا۔ میاں صاحب کی کار پر انگریزی زبان میں ایک مضمون لکھ کر المنار میں اشاعت کے لئے بھجوایا۔ میں المنار کا پروفیسر انچارج تھا۔ میں نے مضمون پڑھا تو اسے اشاعت کے لئے موزوں خیال نہ کیا۔ مضمون نگار میرے اس فیصلے پر سیخ پا ہوا اور سیدھا حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے پاس جا پہنچا۔ آپ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ یہ مضمون ضرور چھپے گا چنانچہ آپ نے مجھے بلا کر اسے شامل اشاعت کرنے کا حکم دیا۔ یہ مضمون "Wolseley" کے عنوان سے المنار کی جون 1951ء کی اشاعت میں چھپ گیا۔ اتفاق دیکھئے جس روز رسالہ چھپ کر ہمارے پاس پہنچا، مضمون نگار میرے پاس آیا اور اس نے روہانسی آواز میں بتایا کہ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور اسے شدید نقصان پہنچا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ اتفاق محض تھا لیکن نہ جانے کیوں مضمون نگار کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اس حادثہ کا کچھ نہ کچھ تعلق اس مضمون کے ساتھ ضرور ہے اور اس نے خود میرے سامنے ایک سے زیادہ بار اپنی اس تحریر پر ندامت کا اظہار کیا۔"

چوہدری محمد علی کے کشتگانِ عشق میں اپنے ہی نہیں غیر بھی شامل ہیں۔ میرے ایک نہایت ہی پیارے غیر از جماعت دوست، شیخ محمد شفیق جو مولانا ثناء اللہ امر تسری کے نواسے ہیں اور جن کے والد، حکیم محمد ابراہیم قادیان میں حکمت کرتے تھے اپنی ملازمت کی آخری ادائیگی میں پنجاب کی سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ میں ڈائریکٹر رہے ہیں۔ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ربوہ جاتے رہتے تھے اور ان کی بعض دیگر لوگوں کے علاوہ چوہدری محمد علی سے بھی ملاقات رہی۔ وہ دن گیا اور آج کا دن آیا، شفیق ان کا بہت احترام کرتے ہیں اور دل سے ان کے حسنِ اخلاق کے معترف ہیں۔

شفیق کو علم ہے کہ چوہدری محمد علی مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے لہٰذا ہماری ہر گفتگو کے دوران چوہدری صاحب کا ذکر ضرور آتا تھا۔ ہم نے کئی بار اکٹھے موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی صحبت سے حظ اٹھایا ہے۔ شفیق ہر بار اپنے ساتھ نئے سے نئے علمی سوالات لے کر جاتے۔ ایسے مواقع پر چوہدری صاحب کسی جہاندیدہ مربی سلسلہ کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتے اور گفتگو کا یہ دلچسپ سلسلہ گھنٹوں تک چلتا رہتا۔ اس دوران دونوں طرف سے چھوڑے گئے چھوٹے چھوٹے چٹکلے محفل کو کشتِ زعفران بنائے رکھتے۔

جولائی 2013ء کے نصف آخر میں چوہدری محمد علی طاہر ہارٹ انسٹی ٹیوٹ میں داخل تھے۔ ان دنوں میں بھی اتفاق سے ربوہ میں تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ ان کے خدمتگار نے بتایا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں تاہم میرے منع کرنے کے باوجود اس نے انہیں جگا دیا۔ میں ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا اور اگلے روز بھی دیر تک ان سے اکتسابِ فیض کرتا رہا۔

اس موقع پر انہوں نے اپنے تین نئے اشعار بھی سنائے جو ذیل میں درج ہیں۔

اس قدر انکار پر انکار سے
لگ نہ جائو تم کہیں دیوار سے
نظریاتی مملکت بننے کے بعد
کیسے کیسے بھوت نکلے غار سے
ہم بھی گزرے پابجولاں سر بکف
شام سے اور شام کے بازار سے

ہمیشہ کی طرح چوہدری صاحب کے ساتھ یہ ملاقات بہت خوشگوار رہی اور تمام تر ضعف کے باوجود سارا وقت ان کی شیریں بیانی کا سلسلہ جاری رہا۔ ''بیمار آدمی کے لئے ایسی ملاقاتیں بہت فرحت افزا ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تکلیف بھول کر اس دور میں واپس چلا جاتا ہے جو اسے بہت عزیز ہوتا ہے۔ آپ آتے رہا کریں۔ بہت لطف آتا ہے آپ کے ساتھ گفتگو کر کے۔''

جب راقم اپنی کتاب ''قریہ ٔ جاوداں'' ترتیب دے رہا تھا تو میں نے چوہدری محمد علی صاحب کے بیان کردہ یہ سارے واقعات کتاب کا حصہ بنانے کا فیصلہ کیا تاہم چوہدری صاحب کی نظرِ ثانی کے بغیر ایسا کرنا مناسب نہ تھا چنانچہ میں نے انہیں اس حصہ کا ڈرافٹ پیش کر دیا۔ چند دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ اسے ملاحظہ فرما چکے ہیں اور ازراہِ شفقت انہوں نے اسے پسند کیا ہے۔ میں نے بخوشی ان واقعات کو کتاب کا حصہ بنا دیا اور درخواست کی کہ وہ اس کتاب کا دیباچہ لکھیں۔ چوہدری صاحب کی صحت ایسی نہ تھی کہ وہ پوری کتاب کا مطالعہ کر سکتے لیکن انہوں نے حامی بھر لی اور پھر وہ دیباچہ لکھا جو اب شاملِ کتاب ہے۔

کتاب چھپنے پر میں نے اس کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پیش کیا اور ان صفحات کی نشاندہی کرنا چاہی جن میں آپ کا ذکر تھا تاہم آپ نے مسکراتے ہوئے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور مجھے کہا کہ وہ اس کتاب کو مکمل طور پر پڑھیں گے۔ انہوں نے اپنا یہ وعدہ واقعی سچ کر دکھایا اور اگلی ملاقات میں بتایا کہ انہوں نے اس کتاب کو لفظ بہ لفظ پڑھا ہے اور یہ کہ یہ ربوہ کی تاریخ کو محفوظ کرنے کی ایک اچھوتی کوشش ہے۔

چوہدری محمد علی صاحب کو ستر سال سے زیادہ مختلف حیثیتوں میں جماعت کی خدمت کا موقع ملا اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہو سکا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی یہ خدمت قبول فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیّین میں جگہ دے۔

☆☆☆☆☆

عشاقِ خلافت میں دمکتا ہوا تارا
الفت کے افق پر وہ چمکتا ہوا تارا
اُس شاعرِ یکتا سا نہیں ہو گا کوئی اب
کہتا ہے مجھے پلکیں جھپکتا ہوا تارا
جمیل الرحمان۔۔۔ ۱۴۔ اگست ۲۰۱۵

مضطر عارفی۔ ایک گوشہ نشین نابغہء روزگار شاعر کے کلام سے انتخاب

جمیل الرحمن

جناب مضطر عارفی کا شمار اُن یکے از روزگار نابغہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ جن کی صلاحیتوں کے اعتراف میں ادبی سیاست نے انتہائی بخل سے کام لیا۔ روایت وجدت کا ایک بہترین و حسین امتزاج ہمارے اس بزرگ شاعر کے یہاں ملتا ہے۔ متنوع موضوعات اور سوز و گداز کی جس کیفیت سے ان کا کلام معمور و منور ہے۔ اس کا مطالعہ کسی بھی تربیت یافتہ ذہین قاری کو سرشار کر سکتا ہے۔ تخیل، علوئے فکر، سادگی، سلاست، خارج و باطن میں برپا قیامتوں کا احوال، اجالوں سے اجالوں تک کا سفر، معاصر حوالے، تازہ و نادر تشبیہات و استعارے، ہنر مندی اور کمال فن پر مستزاد اُن کے اشعار میں وہ جادوئی تاثیر جو کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ اُن کی کلیات،، اشکوں کے چراغ،، میں قدم قدم پر قاری کا راستہ روکتی ہے۔ انگریزی ادب، نفسیات اور فلسفے کے استاد ہونے کے علاوہ ایک بہترین مترجم کی حیثیت سے بھی اُن کی وقیع خدمات کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کھیلوں سے اپنی دلچسپی کی بنا پر وہ ایک مدت قومی باسکٹ بال ایسوسی ایشن کے وائس پریذیڈنٹ بھی رہے۔ ایک مدت سے میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُن کے کلام سے احباب کو متعارف کراؤں سو یہ اشعار دیکھئے۔

کانٹے ہیں اور پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے
پیاسوں کے درمیاں ہیں پیالے پڑے ہوئے
آندھی بھی ہے چڑھی ہوئی، نازک ہے ڈور بھی
کچھ پیچ بھی ہیں اب کے نرالے پڑے ہوئے
رہزن کو بھی فرار کا رستہ نہ مل سکا
چاروں طرف تھے قافلے والے پڑے ہوئے
آمادگی کا نور غزلخواں ہے آنکھ میں
فرطِ حیا سے لب پہ ہیں تالے پڑے ہوئے
اشکوں میں ہیں انا کی چٹانیں چھپی ہوئی
جیسے سمندروں میں ہمالے پڑے ہوئے
دل سر بمہر، کانوں میں روئی بھری ہوئی
آنکھوں میں اختلاف کے جالے بھرے ہوئے
باہر اٹھا کے پھینک دئے بت غرور کے
کب سے تھے یہ مکان میں سالے پڑے ہوئے
تجدید عہد کے لیے پڑھتا ہوں بار بار
گھر میں ہیں کچھ پرانے رسالے پڑے ہوئے

❁

تان کر چہروں کی چادر دھوپ کو ٹھنڈا کیا
دم اگر گھٹنے لگا تو ہاتھ سے پنکھا کیا
لوگ دیواروں کے رستے انجمن میں آ گئے
خود بھی رسوا ہو گئے اوروں کو بھی رسوا کیا
تیری دنیا دائرہ در دائرہ در دائرہ
دائروں کے دیس میں ہم نے سفر تنہا کیا

رات کو شیشہ دکھا کر شہر کی تصویر لی
دور تک کھڑکی کے رستے چاند کا پیچھا کیا
تم تو اک پتھر گرا کر مسکرا کر چل دیے
وقت کا ویران سینہ مدتوں گونجا کیا

✵

ہری بھری گلفام ہیں نیلی پیلی ہیں
دل کے دیس کی پریاں رنگ رنگیلی ہیں

بھنورے بن باسی کیوں بن کو چھوڑ گئے
پھولوں کے خیمے چاک طنابیں ڈھیلی ہیں
خواہش کے خاموش پہاڑ و سانس نہ لو
بادل کا دل بوجھل، پلکیں گیلی ہیں
پت جھڑ کے جاسوس چمن میں پھیل گئے
چاند کا چہرہ زرد ہے کلیاں پیلی ہیں
کس کس کی تعمیل کروں، کس کی نہ کروں
آنکھوں کے احکام بہت تفصیلی ہیں

52-1951

✵

چاند نگر کے چشمے خون اگلتے ہیں
دریا سوکھ گئے ہیں، ساحل جلتے ہیں
جھیلوں کے پردیسی بھیگی راتوں میں
رک رک کر رسے کے پُلوں پر چلتے ہیں
جاگنے والے اشکوں کی آواز نہ سن
آنکھ کے سورج ڈھلتے ڈھلتے ڈھلتے ہیں
یاروں نے تو کبھی کا ملنا چھوڑ دیا
دشمن ہفتے عشرے آن نکلتے ہیں
ہم سیلانی، تم مالک ہو شہروں کے
عیش کرو، آرام کرو، ہم چلتے ہیں

✵

چراغ دشت کی لو ہل گئی ہے
سواری دل کی بے منزل گئی ہے
جو اٹھی ہے کبھی مجبور ہو کر
صداؤں میں صدا گھل مل گئی ہے
اُسے اس کی شہنشاہی مبارک
مجھے میری فقیری مل گئی ہے

✵

ہجوم رنگ سے گھبرا گئی ہے
صبا گلشن سے باہر آ گئی ہے
بھنور سے پڑ گئے خاموشیوں میں
صداؤں سے صدا ٹکرا گئی ہے
ستاروں کے کنارے گھس گئے ہیں
اجالوں کی نظر پتھرا گئی ہے
غریب شہر نے کس کو پکارا
بڑی گہری خموشی چھا گئی ہے

✵

وہ بولتا ہے تو سارا جہان بولتا ہے
زمین بولتی ہے آسمان بولتا ہے
خموش بیٹھے ہیں دونوں اجاڑ کمرے میں
نہ میزبان نہ کچھ میہمان بولتا ہے
جھگڑ رہے ہیں ہوا سے کواڑ کمروں کے
مکین جاگ رہے ہیں، مکان بولتا ہے
کوئی تو ہے جو کھڑا ہے صدا کے پہلو میں
میں بولتا ہوں تو یہ درمیان بولتا ہے
یہ کون گزرا ہے صحرا پہ منکشف ہو کر
قدم قدم پہ قدم کا نشان بولتا ہے

ان اشعار میں جو زندگی، جو جذبے نادر تشبیہات و استعاروں کی شکل میں رونما ہوتے ہیں ۔اُن میں فکر و فلسفہ کی گہرائی ہی نہیں زبان و بیان کی صفائی، روزمرہ اور شاعر کا مولک پن اپنی تازگی اور ندرت پن سے ایک قاری کو کسی خوشگوار حیرت سے دوچار کرنے کے لیے کافی ہے

مظطر عارفی کی شاعری کی ابتدا گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی سے ہوتی ہے۔ جس قافلے کے سرخیل ناصر کاظمی تھے۔ اس قافلے میں مضطر عارفی، راجہ غالب احمد، اور احمد مشتاق کے اسمائے گرامی کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور مندرجہ بالا اشعار اس کے شاہد ہیں۔

✵

مضطر عارفی کے یہاں تنہائی اور اداسی دھیان کی لو لگائے، آسن جمائے جس گیان کے حصول کی خبر دیتی ہے۔ اس میں زمینی حقائق کے ساتھ روحانی صداقتوں کی وہ مہک ہے۔ جس نے انسانیت کی اقدار کو ہمیشہ معتبر رہنے میں مدد دی ہے۔۔ روح کا اضطراب شعری سطح پر معرفت میں کیسے ڈھلتا اور اپنی آنچ دیتا ہے۔ مضطر عارفی کو پڑھتے ہوئے اس کا شدت سے ادراک ہوتا ہے۔

مضطر جی اک کام کرونا
صبح کو رو رو شام کرونا
میرا نام چرانے والو
واپس میرا نام کرونا
آنکھیں دیں، آئینے بخشے
چہرے بھی انعام کرونا
شہر پناہ کو ڈھانے والو
ملبہ بھی نیلام کرونا

عیب تراشو، غیب شناسو
تم بھی کبھی آرام کرونا

اتنی مجبوریوں کے موسم میں
جشن برپا ہے دیدہء نم میں
ہجر کی شب ہی وصل کی شب ہے
یعنی رمضان ہے محرم میں
ایک ترتیب ہے پس پردہ
پیچ در پیچ زلف برہم میں
جس سے پوچھو وہی فرشتہ ہے
کیا کوئی آدمی نہیں ہم میں
میرے مالک کوئی بشارت دے
دل کی تبدیلیوں کے موسم میں

زیر لب کہیے، برملا کہیے
،،کہیے کہیے مجھے برا کہیے،،
اب تقاضہ ہے مصلحت کا یہی
واعظ شہر کو خدا کہیے
میرا اپنا کوئی وجود نہیں
عکس مجھ کو وجود کا کہیے
وہ جو آکر چلا گیا لمحہ
اُس کو صدیوں کا خوں بہا کہیے
قاتل شہر میرے قتل کے بعد
مجھ کو اپنا کہے تو کیا کہیے

بچہ، سچا کیوں لگتا ہے
اتنا اچھا کیوں لگتا ہے
سورج ڈوبنے لگتا ہے جب
سایہ لمبا کیوں لگتا ہے
تیرا نام لکھوں تو کاغذ
اجلا اجلا کیوں لگتا ہے
اتنے تاروں کے جھرمٹ میں
چاند اکیلا کیوں لگتا ہے
منزل تو آباد ہے لیکن
رستہ سونا کیوں لگتا ہے

زمیں کا زخم بھی اب بھر رہا ہے
نہ دلی ہے نہ امر تسر رہا ہے
صداقت سامنے عریاں کھڑی ہے
وہ آئینے سے جھگڑا کر رہا ہے
پگھلنے کی اسے فرصت نہیں ہے
یہ پتھر عمر بھر پتھر رہا ہے
اُسے معلوم ہے ردی کا بھاؤ
وہ اخباروں کا سوداگر رہا ہے
محبت ہو گئی ہے تجھ سے مظفر
تُو کس محبوب کا نوکر رہا ہے

گھر کے کواڑ زیر زباں بولنے لگے
مالک چلے گئے تو مکاں بولنے لگے
سورج چلا گیا تو اتر آئی چاندنی
پلکوں پہ روشنی کے نشاں بولنے لگے
وہ سنگ دل بھی کوئے ندامت میں جابسا
پتھر بھی پانیوں کی زباں بولنے لگے
پہلے خلائے جاں میں خموشی رہی مگر
پھر یوں ہوا کہ کون و مکاں بولنے لگے
نمرود نے جلائی تھی جو آگ، بجھ گئی
آزردگان آزر جاں بولنے لگے
کس کی مجال تھی کہ سرِ دار بولتا
بولے ہیں ہم تو تم بھی میاں بولنے لگے
مظفر ضمیرِ لفظ کے سُونے مکان میں
وہ حبس تھا کہ وہم و گماں بولنے لگے

مظفر عارفی معاشرتی منافقت، فقیہان حرم کی عیاریوں اور ایک تنہا حساس ناظر کی کیفیات کا نقشہ جس خوبی سے کھینچتے ہیں۔ اور جس طرح اپنے محبوب کے ہر پہلو سے اپنے آپ کو وابستہ رکھتے ہیں ۔اس کا کرشمہ آپ آگے دیکھیں گے۔ ابھی تو یہ دیکھیے کہ لفظ وخیال اپنا دائرہ کیسے مکمل کرتے ہیں ، کسی بھی مضمون کا نیا پہلو کیا ہوتا ہے اور سادگی و پرکاری کس بلا کا نام ہے۔

نزاکت خیال اور اس کائنات میں اپنی بے بضاعتی کے احساس کے باوجود زندگی، انسان اور اس کے خالق سے عشق کا وفور مظفر عارفی کے یہاں انوکھی تشبیہات و استعاروں کے ساتھ جابجا بکھرا نظر آتا ہے۔ ہجر اور ہجرت۔ لازم نہیں کہ خارج کی سطح پر واقع ہو۔ یہ دونوں کیفیات جب اندر کا سفر طے کرتی ہیں تو جس کیف و عرفان کی خبر لاتی ہیں ۔اشکوں کے چراغ اس کی لو سے جھلملا رہے ہیں۔

تیرے کوچے میں بکھر جاؤں اگر
حادثہ اک یہ بھی کر جاؤں اگر
میں ترا ہی عکس ہوں لیکن ترے
پاس سے ہو کر گزر جاؤں اگر
واپس آجاؤں میں اپنے آپ میں
اپنی آہٹ سے نہ ڈر جاؤں اگر

حادثہ ہو جائے شہر ذات میں
اس ٹریفک میں ٹھہر جاؤں اگر
جی اٹھوں مضطر ہمیشہ کے لیے
مسکرا کر آج مر جاؤں اگر

❁

اپنے اندر کی بھی سیاحت کر
کبھی اپنی طرف بھی ہجرت کر
اپنے اندر کے آدمی سے مل
اس ملاقات کی بھی صورت کر
بوریت کچھ تو دور ہو جائے
میرے دشمن کوئی شرارت کر
منطق الطیر بخشنے والے
پر پرواز بھی عنایت کر
عشق میں مصلحت نہیں ہوتی
عشق کر اور بے ضرورت کر
اشک در اشک روح کو بھی کھنگال
اٹھ کے راتوں کو غسل صحت کر

❁

فرقت کو وصال کر دیا ہے
تو نے تو نہال کر دیا ہے
آنسو ہی نہیں مریض دل کو
ہر زہر ابال کر دیا ہے
یہ دین ہے تیری دینے والے
جو غم بھی ہے پال کر دیا ہے
فرہاد کارک گیا ہے تیشہ
پتھر نے سوال کر دیا ہے
چپکے سے چلا گیا بچھڑ کر
مضطر نے کمال کر دیا ہے

❁

دل دیا ہے تو اب اتنا کر دے
اس کو کچھ اور کشادہ کر دے
بھر نہ جائے کہیں سہلانے سے
زخم کو اور بھی گہرا کر دے
کہیں ایسا نہ ہو میرا سایہ
تیری تصویر کو دھندلا کر دے
بھول جائے نہ مرا نام مجھے
اس کو الزام پہ کندہ کر دے
مل نہ جائے کہیں آوازوں میں
میری آواز کو رسوا کر دے

❁

کہیں ایسا نہ ہو کوئی لمحہ
تجھ کو چھو کر تجھے تنہا کر دے
لفظ مر جائے اگر بچپن میں
اس کا وارث کوئی پیدا کر دے
بخش دے میری علامت مجھ کو
میرے سر پر مرا سایا کر دے
رنگ و بو بانٹ دے اس سے لے کر
پھول کے بوجھ کو ہلکا کر دے
میں بکھر جاؤں تو مجھ کو چن کر
اپنے آنگن میں اکٹھا کر دے
میں بھی پہچان لوں خود کو شاید
میری جانب مرا چہرا کر دے
چھین کر اشک سے اس کی آواز
اور بھی اس کو نہتا کر دے
آئینے ٹوٹ نہ جائیں مضطر
دل کی دیوار کو سیدھا کر دے

❁

خود سپردگی کا یہ وفور، محبوب کے دامن میں سمانے کی خواہش، اس کے رنگ و بو سے اکناف عالم کو مہکانے کی آرزو اور راست عشق سے وابستگی کا یہ عالم۔۔ کیا مضطر کو معاصر شاعری میں سب سے الگ کھڑا کر تا دکھائی نہیں دیتا؟ اشک سے اس کی آواز بھی چھن جانے کی خواہش کیا اس ادب کی یاد نہیں دلاتی۔ جس میں غبار میر بھی محبوب سے دور بیٹھنے کا متقاضی ہوتا ہے۔

❁

ندرت خیال، لفظ کا جدلیاتی استعمال اور تحرک، پیکر تراشی اور ابہام کے لیے کسی عہد یا عمر کی تخصیص نہیں ہوتی۔ یہ عناصر ایک سچے شاعر کی ہر تخلیق میں خود بخود در آتے ہیں۔

گلشن سے وہ جب نکل رہا تھا
جو پیڑ تھا ہاتھ مل رہا تھا
پروا تھی نہ اس کو ڈر کسی کا
سورج سر عام ڈھل رہا تھا
منزل بھی قریب آ گئی تھی
رستہ بھی لہو اگل رہا تھا
آیا تھا پہاڑ سے اتر کر
صحرا میں جو پھول جل رہا تھا
اس در سے دے رہا تھا دستک
دروازوں کے دل بدل رہا تھا
سردی تھی کہ بڑھ رہی تھی مضطر
سورج تھا کہ پھر بھی ڈھل رہا تھا

❁

اشک چشمِ تر میں رہنے دیجئے
گھر کی دولت گھر میں رہنے دیجئے
رِیت کی خوشبو، روایت کی مہک
راہ کے پتھر میں رہنے دیجئے
گھر کی تصویریں نہ ہو جائیں اداس
آئینوں کو گھر میں رہنے دیجئے
راہ میں کانٹے بچھا دیجے، مگر
پھول پس منظر میں رہنے دیجئے
کچھ نہ کچھ تو فرق بہر امتیاز
پھول اور پتھر میں رہنے دیجئے

❋

بات سنتے نہ بات کرتے ہو
کس قدر احتیاط کرتے ہو
پہلے اس کا جواز ڈھونڈتے ہو
پھر کوئی واردات کرتے ہو
جب بھی کرتے ہو قتل مضطر کا
سرِ نہرِ فرات کرتے ہو

❋

عشق اس کے عہد میں بے دست و پا ہو جائے گا
آنکھ استنبول، سینہ قرطبہ ہو جائے گا
میری قسمت کی لکیریں دیکھ کر کہنے لگا
یہ لکیریں مل گئیں تو حادثہ ہو جائے گا
ان بھری گلیوں میں پھر تارہ، اسی میں خیر ہے
اپنے اندر جا چھپا تو لاپتا ہو جائے گا

❋

وہ ہنسنے کو تو ہنس رہا ہوئے گا
مگر حال اس کا برا ہوئے گا
وہ لمحہ جو امسال رک کر ملا
خدا جانے کب کا چلا ہوئے گا
جسے میرے ایماں کا بھی علم ہے
وہ جھوٹا نہیں تو خدا ہوئے گا
وہ آئے گا اخبار اوڑھے ہوئے
عجب کاغذی سلسلہ ہوئے گا
خبر جس میں چھاپی گئی تھی مری
وہ اخبار اب بک گیا ہوئے گا

❋

جھگڑے ہے پھول پھول، لڑے ہے کلی کلی
ہوتا ہے ان دنوں یہ تماشہ گلی گلی
چہروں کے زرد چاند پڑے ہیں زمین پر
مٹی میں مل رہا ہے یہ سونا ڈلی ڈلی
کرتے رہے جھروکہ ءدرشن سے گفتگو
پر جا کے پاس چل کے نہ آئے مہابلی

❋

دار و رسن سے ماپ مرے قد کو لاکھ بار
اک بار خود کو میرے ترازو میں تول بھی
ہو گا اک اور فیصلہ اس فیصلے کے بعد
اترا نہ اسقدر کہ یہ دنیا ہے گول بھی

❋

مشتعل ہے مزاج کانٹوں کا
کیجئے کچھ علاج کانٹوں کا
اک طرف مملکت ہے پھولوں کی
اک طرف سامراج کانٹوں کا
اب بھی دل پر ہے راج پھولوں کا
راج کل تھا نہ آج کانٹوں کا

❋

یہ شکایت جو زیر لب کی ہے
ہم نے اک بات بے سبب کی ہے
آج کا دن طویل تھا کتنا
آج برسوں کے بعد شب کی ہے
گھر میں بیٹھے رہو خدا کے لیے
شہر میں تیرگی غضب کی ہے
کون ہے جو نہیں اسیر اس کا
عشق تقصیر ہے تو سب کی ہے
اُس کی آواز کے گلے لگ کر
اپنی آواز بھی طلب کی ہے

❋

پھر تیر تبسم کا نشانے پہ لگا ہے
لگتا ہے اُسی زخم پرانے پہ لگا ہے
رکھ لینا اسے عشق کا انعام سمجھ کر
پتھر جو مرے آئینہ خانے پہ لگا ہے
اب آج سے اس شہر کا ہر شخص ہے مجرم
نوٹس یہ کھلے شہر کے تھانے پہ لگا ہے
خوشبو کو، تبسم کو چھپا کر نہیں رکھتے
الزام یہ پھولوں کے گھرانے پہ لگا ہے
گرتی ہوئی دیوار تو گرنے کو تھی مضطر
سیلاب کا ریلا بھی ٹھکانے پہ لگا ہے

❋

یادوں کی بارات لیے پھرتا ہوں میں
صدیاں اپنے ساتھ لیے پھرتا ہوں میں
مجھ کو بھی معلوم نہیں وہ بات ہے کیا
سینے میں جو بات لیے پھرتا ہوں

❋

اشکوں نے دل کی دیوار گرادی ہے
گھومنے پھرنے کی امشب آزادی ہے
دشت نے چاہا تھا اس کو تسلیم کرے
قیس نے اس کی یہ خواہش ٹھکرا دی ہے
فرصت ہو تو اب اُس کی پہچان کرو
ہم نے پانی پر تصویر بنا دی ہے
دل کی دلی کے کھنڈرات ہیں مقتل تک
اس سے پرے آبادی ہی آبادی ہے
،، سچی باتوں،، سے ناحق بدنام ہوا
عشق بھی عبدالماجد دریابادی ہے

کیا ہے کہ مضطر عارفی کا لہجہ انڈر ٹون رہتا ہے اور کہیں لاوڈ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود تلخی ،طنز، شعری نکتے کے اظہار اور کیفیت میں ایک ایسا توازن ان کے یہاں موجود ہے۔ جو آہستہ آہستہ قاری کو اپنی شعوری گرفت میں لے لیتا ہے ۔ نامانوس کو مانوس بنانے کا عمل نت نئی تشبیہات ،استعاروں اور علامتوں میں اس بے ساختگی سے راہ پاتا ہے کہ ہر طرف رنگ بکھر جاتے ہیں۔ ذرا دیکھیے

وہ التفات کے برسے ہیں رات بھر بادل
زمین جاگ اٹھی، سبز ہو گئے جنگل
جہاں پہ بیٹھ گئے شہر ہو گئے آباد
جہاں رکے وہیں جنگل میں ہو گیا منگل
لرز رہی ہیں ستاروں کی سرخ دیواریں
یہ آفتاب مرے سانس سے نہ جائیں پگھل
نہ چھیڑ خاک نشینوں کو اس قدر مضطر
چھلک نہ جائے فقیروں کے صبر کی چھاگل

جاں بکف اشک بجام آئے گی
نالہ کرتی ہوئی شام آئے گی
دربدر روتی پھرے گی خلقت
کوئی تدبیر نہ کام آئے گی
شور رک جائے گا آوازوں کا
اک صدا بر سرِ عام آئے گی
سائے چھپ جائیں گے دیواروں میں
منزلِ ماہ تمام آئے گی
داغ در داغ جلیں گے سینے
یاد یاروں کی مدام آئے گی
عمر بھر دل کے گلی کوچوں سے
اک صدا نام بنام آئے گی
دن چڑھے نکلیں گے راہی گھر سے
دل کے چوراہے میں شام آئے گی

جلا کر مرا پہلے گھر احتیاطا
اب آیا ہے وہ بام پر احتیاطا
پتہ تھا اگرچہ اسے اپنے گھر کا
وہ پھرتا رہا دربدر احتیاطا
تو سن لے جو خلق خدا کہہ رہی ہے
مگر اس کو کریانہ کر احتیاطا

درد دے، درد کے خزانے دے
دینے والے کسی بہانے دے
تُو اگر مسکرا نہیں سکتا
دوسروں کو تو مسکرانے دے
عشق کا اندلس ملے نہ ملے
کشتیاں تو مجھے جلانے دے

دیں جدا دینے لگے، دنیا جدا دینے لگے
جس قدر مانگا تھا اس سے کچھ سوا دینے لگے
چاند بھی کھڑکی کے رستے آ گیا دالان میں
آہٹوں کو گھر کے آئینے صدا دینے لگے
راستوں کے بے تکے پن کا نہیں کوئی علاج
دشت میں جا کر حوالہ شہر کا دینے لگے
قافیوں سے لڑ پڑے تو پھاڑ دی ساری غزل
جرم دیواروں کا تھا، گھر کو سزا دینے لگے

گفتگو کب کی بند ہے اب تو
وہ بڑا عقل مند ہے اب تو
پہلے اک دلربا تبسم تھی
زندگی زہر خند ہے اب تو
پھر سر شاخ لہلہانے لگا
گل کا پرچم بلند ہے اب تو
سب مومن تھے تُو کافر تھا
یہ بھی اک طرفہ چکر تھا
تُو ہی تھا گھر کا دروازہ
تُو ہی کونے کا پتھر تھا
اندر صدیاں سوچ رہی تھیں
باہر لمحوں کا لشکر تھا
شہر ذات کا رہنے والا
اپنی ذات سے ہم بستر تھا
اتنا ہنسنے والے کو جب
چھو کر دیکھا تو پتھر تھا

میرا گھر بھی تیرا گھر تھا
تُو اندر تھا، تُو باہر تھا
میں اک بھوکا پیاسا راہی
تُو میرا حوضِ کوثر تھا
سب نے آنسو روک لیے تھے
بستی کو بارش کا ڈر تھا
حشر کا دن تھا گھر کے اندر
باہر بھی روزِ محشر تھا
باہر سورج ڈوب رہا تھا
اندر برفانی بستر تھا

❁

تیل کے تالاب میں مچھلی کا منظر دیکھتے
رام راجا تھے تو پرجا کا سوئمبر دیکھتے
تجربہ تم کو بھی ہو جاتا عذابِ دید کا
تم اگر ان فاصلوں کو اپنے اندر دیکھتے
وہ سراسر لمس کی لذت سے تھا نا آشنا
لفظ کو چھونے سے پہلے اس کے تیور دیکھتے
پہلے اپنا نام کھدواتے فصیلِ شہر پر
پھر گزرتے موسموں کا چور چکر دیکھتے
خون کی پیاسی تھی گر شہرِ نگاراں کی زمیں
کوئی باغی ڈھونڈ لاتے کوئی کافر دیکھتے
بید جی کرسی کے کاٹے کا بھی کچھ کرتے علاج
کوئی پوتھی کھول لیتے کوئی منتر دیکھتے

❁

جسم اب بھی ہے جان اب بھی ہے
عشق کا امتحان اب بھی ہے
اب بھی پیاسی ہے سرزمینِ نجف
دھوپ کا سائبان اب بھی ہے

جا چکا وہ مگر کفِ جاں پر
نقشِ پا کا نشان اب بھی ہے
ڈھ چکا کب کا قصرِ استبداد
میرا کچا مکان اب بھی ہے

❁

تمام عمر کٹی اور فیصلہ نہ ہوا
کہ جرمِ عشق کا اُس کا تھا یا ہمارا تھا
شبِ وصال میں فرقت کے فاصلے نہ گئے
کہ وصلِ یار بھی فرقت کا استعارہ تھا
میں اپنی ذات سے آگے سفر پہ کیا جاتا
کہ اس جزیرے کے چاروں طرف کنارہ تھا
یہ اور بات ہے منزل جدا جدا تھی مگر
جو راستہ تھا ہمارا وہی تمہارا تھا

❁

شاعری ایک مسلسل ریاضت اور کارِ عشق ہے
--چار دن تو ہر کوئی شاعری کر لیتا ہے۔ لیکن 80
سال کا بلا تکان سفر یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ
شاعری مظہر عارفی کا عشق ہی نہیں، ان کی زندگی کا
رویہ ہے۔ تبھی تو وہ ایسے اشعار کہنے پر قادر ہیں۔

اندھیرا اب ادھر شاید نہ آئے
اسے رستہ نظر شاید نہ آئے
دلِ نادان کو تم جانتے ہو
یہ باغی راہ پر شاید نہ آئے
تم اپنے سائے میں آرام کر لو
کہ رستے میں شجر شاید نہ آئے
کنارے توڑ کر نکلا ہے سیلاب
کناروں کی خبر شاید نہ آئے

❁

اندر آنکھیں، باہر آنکھیں
جاگ رہی ہیں گھر گھر آنکھیں
عہد کے ماتھے پر اُگ آئیں
کیسی کیسی بنجر آنکھیں
آوازوں پر چسپاں کر دو
لفظوں کی بے منظر آنکھیں
رہ چلتوں کو تکتے تکتے
ہو جاتی ہیں پتھر آنکھیں
ٹوٹ رہا ہے عہد کا انساں
دل دلی، امرتسر آنکھیں

❁

وہ بے ادب حدود سے باہر نکل گیا
سورج کو اس نے ٹوکنا چاہا تو جل گیا
میرے لیے جلائی تھی اُس نے چتا مگر
شعلے ہوئے بلند تو موسم بدل گیا
دھرتی کو کھا کے ساحلوں کو چاٹتا ہوا
نفرت کا سانپ کتنے سمندر نگل گیا
کس طرح اپنے آپ سے لڑتا میں جو مکھی
غصہ کیا جو ضبط تو آنسو نکل گیا
نکلے تھے لوگ عہد کا یوسف خریدنے
بازار میں گئے تو ارادہ بدل گیا
ایوانِ شہریار میں پھسلن تھی اس قدر
جو شخص بھی قریب سے گزرا سنبھل گیا

❁

آنکھ میں جو آنسو لرزا تھا
اُس پر تیرا نام لکھا تھا
سب تیرے تھے تُو سب کا تھا
پھر بھی تُو کتنا تنہا تھا

میرے اندر جو بچہ تھا
میں جھوٹا تھا وہ سچا تھا
سولی تھی مجھ سے بھی اونچی
میں سولی سے بھی اونچا تھا
میں نے جو چہرا دیکھا تھا
وہ تجھ سے ملتا جلتا تھا
منزل کے اندر منزل تھی
رستے کے اندر رستہ تھا
سب صدیاں تیری صدیاں تھیں
ہر لمحہ تیرا لمحہ تھا
اور بھی تھے دنیا میں اچھے
لیکن تُو سب سے اچھا تھا
دنیا تجھ کو ڈھونڈ رہی تھی
تُو سب کے ہمراہ کھڑا تھا

❁

میں نے جب پتھر کھایا تھا
تُو نے چوٹ کو سہلایا تھا
دیواریں ہی دیواریں تھیں
در تھا نہ کوئی دروازہ تھا
میں ہمسائے سے کیا لڑتا
ہمسایہ تو ماں جایا تھا
تُو تھا آدھی رات کا آنسو
تُو دھرتی کا سرمایہ تھا
ماضی، حال اور مستقبل پر
چاروں اور ترا سایہ تھا
تُو آئینہ در آئینہ
آئینوں سے ٹکرایا تھا
سورج تھا بچپن کا ساتھی
چاند پرانا ہمسایہ تھا
شہروں میں تھیں ننگی سڑکیں
بن میں سایہ ہی سایہ تھا
شجر ممنوعہ سے مل کر
میرا دل بھی للچایا تھا
اک لمحہ لمحوں سے کٹ کر
مضطر سے ملنے آیا تھا

❁

خدمت کے مقام پر کھڑا ہوں
چھوٹا ہوں مگر بہت بڑا ہوں
منسوخ نہ ہو سکوں گا ہرگز
قدرت کا اٹوٹ فیصلہ ہوں
بولوں تو ہوں عہد کی علامت
خاموش رہوں تو معجزہ ہوں

❁

بال جب آئینے میں آنے لگا
عکس اندر سے ٹوٹ جانے لگا
منزلوں کو اجالنے والے
قافلوں کو کسی ٹھکانے لگا
ہم نے صدیوں کو سہہ لیا ہنس کر
اب نہ لفظوں کے تازیانے لگا
آنکھ، آئینہ، عکس، سب تیرے
کون یہ درمیان آنے لگا
لا الہ کا ہو یا انا الحق کا
کوئی نعرہ کسی بہانے لگا

❁

پھر مجھے اندلس بلانے لگا
میں بھری کشتیاں جلانے لگا
پہلے پوچھا ہمارا نام پتا
پھر ہمیں گالیاں سنانے لگا
اُس نے گل کر دیے چراغ تو میں
اشک در اشک جھلملانے لگا

❁

چھوٹی بحر کی روانی اور تندی پرانی تیز شراب کی طرح ہوتی ہے۔ اکثر بڑے شاعروں نے اس میں اپنی طبع آزمائیوں کے خوب گل کھلائے ہیں۔ لیکن مضطر عارفی نے دونوں طرح کمال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی

تم کو بھی کوئی بد دعا لگتی
تم بھی کہتے کبھی خدا لگتی
کس قدر حبس ہے سرِ مقتل
ابر کھلتا تو کچھ ہوا لگتی
ناخدا اس میں تیرا کیا جاتا
میری کشتی کنارے جا لگتی
دل کی دلی اجڑ گئی مضطر
پھول والوں کی کیا صدا لگتی

❁

اُسے یہ ڈر ہے زمین پر آسماں گرے گا
بدل کے رکھ دے گا شکل و صورت جہاں گرے گا
تم اپنی بانہوں میں اس کو بڑھ کر سنبھال لینا
ہوا کے رخ پر جہاز کا بادباں گرے گا
نجات مل جائے گی سفر کی صعوبتوں سے
سمندروں میں سراب عمرِ رواں گرے گا
کبھی تو دیکھے گا اپنی صورت وہ آئینے میں
کبھی تو اپنی نظر سے وہ بدگماں گرے گا
خدا کرے آسماں کا خیمہ رہے سلامت

مکین بھی اب تو کہہ رہے ہیں مکاں گرے گا
بدن کی اس آگ کو جلاتے رہو عزیزو
تمہارے اوپر ہی پھر پھرا کر دھؤاں گرے گا
پکڑنے والے بھی منتظر ہیں چھتوں پہ مضطر
کہ یہ پرندہ گرا تو اب نیم جاں گرے گا

۞

ہر ایک سے گلے ملا، ہنس کر جدا ہوا
وہ جاچکا تو شہر میں محشر بپا ہوا
گل چیں اداس، پھول پریشاں، چمن خموش
عہد غم فراق میں کس کا بھلا ہوا
دینے لگا دکھائی کنارہ وجود کا
مدت کے بعد پیڑ نظر کا ہرا ہوا
مٹی میں مل کے بھی نہ کسی کام آ سکا
رستے کا روگ بن گیا پتھر پڑا ہوا
مضطر بڑے طویل ہیں فرقت کے فاصلے
راہی تھکا تھکا ہوا اور دن ڈھلا ہوا

۞

اگر آتا نہ ہو انکار پڑھنا
کبھی اس عہد کے اخبار پڑھنا
یہی تو ہے جھلک صبح ازل کی
کسی چہرے کو پہلی بار پڑھنا
میں مل کر آرہا ہوں اک حسین سے
مجھے اے آئینہ بردار پڑھنا
تمہی چاروں طرف لکھے ہوئے ہو
مرے دل کے درودیوار پڑھنا
بدل جائے گا مضطر میرا مفہوم
کبھی مجھ کو نہ اتنی بار پڑھنا

۞

نیلام گھر کی بولی جیتے بھی اور ہرے بھی
میرے وطن کے سکے کھوٹے بھی تھے کھرے بھی
آواز کے کنارے کوئی تو بولتا ہے
کوئی تو بولتا ہے آواز سے پرے بھی
آشوب آرزو کے اس عہد بے نظر میں
متروک ہوگئے تھے دل کے محاورے بھی

۞

یادوں کی گزر گئیں سپاہیں
تکتی رہیں دور سے نگاہیں
پت جھڑ سے حساب مانگتی ہیں
پیڑوں کی خزاں رسیدہ بانہیں
ہونا تھا جو ہو چکا ہے مضطر
اب چین سے عمر بھر کراہیں

۞

حالات سے کس طرح نبھاہیں
جینا بھی اگر نہ لوگ چاہیں
منظر کی نہ تاب لاسکیں گی
بھولے سے اگر ملیں نگاہیں
پتوں پہ لکھی ہوئی ہیں مضطر
پت جھڑ کی تمام اصطلاحیں

۞

روکے سے نہ رک سکیں گی آہیں
لمبی ہیں محبتوں کی بانہیں
خوشبو کے خرید کر جزیرے
پھولوں نے تراش لیں پناہیں
یارب کوئی آبرو کا آنسو
پانی کو ترس گئیں نگاہیں

پت جھڑ کے شہید سو رہے ہیں
تاحد نظر ہیں خانقاہیں
یادوں میں گھری ہوئی ہیں مضطر
ماضی کی تمام سیرگاہیں

۞

شہروں سے نکل کے راستوں نے
کھنڈرات میں ڈھونڈلیں پناہیں
تصویر کو آگیا پسینہ
آئینے کی تھک گئیں نگاہیں
ہے ایک سے اک حسین بڑھ کر
چاہیں بھی تو کس حسیں کو چاہیں
دیوار پہ بولتے ہیں کوے
آنگن میں گڑی ہوئی ہیں بانہیں
مولا اسے سایہ دار کردے
ننگی ہیں مرے وطن کی راہیں
مضطر ہے جہان بھر کا ضدی
چاہے گا وہی جو آپ چاہیں

۞

نئے شعرا کے لیے جناب مضطر عارفی سے سیکھنے کے لیے اُن کے اسلوب میں بہت کچھ ہے۔ کیسے ایک ذاتی شدید جذباتی کشمکش کو معروضی سطح پر دوسروں کی واردات میں متشکل کیا جاسکتا ہے اور کیسے ان چھوئے، ان گھڑ، غیر متوقع لفظوں کے جمال و استعمال سے ایک شعری تجربہ تخلیق کیا جاتا ہے ۔اس کی امثال اشکوں کے چراغ کے لاتعداد صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ سادگی وپرکاری کے ساتھ اچانک ایک انوکھا مضمون قاری کو ایک عجب سی حیرت میں مبتلا کردیتا ہے۔ اور روزمرہ کے

محاورے اشعار میں نئی جوت جگاتے محسوس ہوتے ہیں

حادثہ یوں تو ٹل گیا ہے بہت
گھر کا نقشہ بدل گیا ہے بہت
عہد یوں بھی سفید پوش نہ تھا
کوئی کالک بھی مل گیا ہے بہت
زندگی رہ گئی ہے رستے میں
وقت آگے نکل گیا ہے بہت
کھڑکیاں کھول دو مکانوں کی
اب تو سورج بھی ڈھل گیا ہے بہت
اس کی شاخیں تراش دو مضطر
یہ شجر پھول پھل گیا ہے بہت

میں برا اور وہ بھلا ہے بہت
میرے اللہ ! فاصلہ ہے بہت
دیکھیے جیت کس کی ہوتی ہے
مجھ سے میرا مقابلہ ہے بہت
ٹوٹ جائے نہ فرطِ لذت سے
آئینہ مسکرا رہا ہے بہت
عقل ناراض ہو گئی مضطر
دلِ نادان بولتا ہے بہت

شور ہونے لگا پتنگوں میں
روشنی بٹ گئی ہے رنگوں میں
کیسے کیسے جوان مارے گئے
حرف و صوت و صدا کی جنگوں میں
اُن کو ایفائے عہد کا ہے خیال
ہے شرافت ابھی لفنگوں میں

آنکھ لڑتی، زباں جھگڑتی ہے
زندگی گھر گئی تلنگوں میں
آندھیاں بھی نہ اُن کو کھول سکیں
ایسی گرہیں پڑیں پتنگوں میں

کچھ تو دنیا بھی آنی جانی لگی
کچھ گلی یار کی سہانی لگی
اُن سے مل کر بدل گئی ہر چیز
عمر فانی بھی جاودانی لگی
اک قیامت گزر گئی دل پر
سننے والوں کو اک کہانی لگی
سر جھکا کر جو غور سے دیکھا
ہر نئی آرزو پرانی لگی

جانے کیا جی میں ٹھان بیٹھے ہیں
تیری محفل میں آن بیٹھے ہیں
ہجر کا غم نہ وصل کی امید
جان ہے نہ جہان، بیٹھے ہیں
اس طرف آگ اُس طرف بھی آگ
اور ہم درمیان بیٹھے ہیں
اشک برسے تو اس قدر برسے
ڈھے گئے دل، مکان بیٹھے ہیں
دوست احباب ہی نہیں مضطر
اور بھی بدگمان بیٹھے ہیں

ارمغاں ہے یہ پیر کامل کا
داغ ہے یا چراغ ہے دل کا
گر گئی اُس کے ہاتھ سے تلوار
جاگ اٹھا ضمیر قاتل کا
منزلوں سے گزر رہے ہیں لوگ
پوچھتے ہیں نشان منزل کا

غمِ دنیا بھی خوب ہے پیارے
اس کی عادت اگر نہ ہو جائے

صبحِ عہدِ شباب ہو جیسے
فرصت بے حساب ہو جیسے
اتنی ناکامیابیوں کے بیچ
زندگی کامیاب ہو جیسے
آرزوؤں کی دھوپ چھاؤں میں
آرزو محوِ خواب ہو جیسے
اُن کو دیکھا تو یوں ہوا محسوس
عشق کارِ ثواب ہو جیسے
دیکھتے ہیں وہ اس طرح مضطر
کوئی ان کا جواب ہو جیسے

یوں سوالات سر میں رہتے ہیں
جیسے مجبور گھر میں رہتے ہیں
آنسوؤں کو نہ روکئے صاحب
یہ مسافر سفر میں رہتے ہیں
دشت در دشت آہوانِ خیال
انتظارِ سحر میں رہتے ہیں
فصلِ وحشت میں احتیاطاً لوگ
پا بہ زنجیر گھر میں رہتے ہیں

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی صاحبِ کمال ہوا

❁

نقاب پوش کھڑے ہیں صدا کی سرحد پر
فصیل شہر خموشاں ہے آہٹوں سے پرے
خدا کرے کہ مری یاد بھول جائے اُسے
میں اُس کو بھول سکوں، یہ کبھی خدا نہ کرے

❁

وہ چاہتا تھا کہ دو چار روز ہنس کے رہے
یہ اور بات ہے سونے کے سانپ ڈس کے رہے
فقیہہ شہر نے قدغن لگا دی موسم پر
جمال یار کے بادل مگر برس کے رہے
نہ گل رہا ہے نہ گل چیں نہ رسم گل چینی
رہی تو لمس کی لذت، نظر کے چسکے رہے
ہوا نہ ہو گا کبھی یہ ستم زمانے میں
کہ گوجرے میں رہے یار، آپ ڈسکے رہے
بدن سے مل کے بدن اور ہو گئے تنہا
جو فاصلے تھے وہی فاصلے ہوس کے رہے

❁

اس شہر انتخاب کے پتھر اٹھا لیے
واللہ ہم نے لعل و جواہر اٹھا لیے
گھر سے چلے تو خاک وطن سر پہ ڈال لی
پلکوں پہ جیتے جاگتے منظر اٹھا لیے
پت جھڑ کے زرد شور میں باد شمال نے
افتادگان ماہ دسمبر اٹھا لیے
چہرے کی تیز دھوپ میں چہرہ لپیٹ کر
زلف سیاہ یار کے اژدر اٹھا لیے

دار و رسن کے مذہب و آئین کے خلاف
ہم جا چکے تو آپ نے پتھر اٹھا لیے

❁

آنسو گرا تو سوچ کا سینہ لرز گیا
طوفان آہٹوں کے سمندر میں آ گئے
ہنگام ذبح عمر گزشتہ کے واقعات
ایک ایک کر کے ذہن کبوتر میں آ گئے
خواب سحر سے جاگ بھی نادان! آنکھ کھول
سورج پگھل کے جام گل تر میں آ گئے

❁

مظہر عارفی کے یہاں جیسے ذاتی کرب کی شدید صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ ویسے ہی اُن کی کائیناتی حقائق پر گہری نظر قاری پر شاعر کے ادراک و احساس کے وہ گوشے وا کرتی ہے۔ جو اسے ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی ارادے اور عمل کی کوتاہیوں سے آشنا ہونے کے باوجود اس کی روح ایک نئی آگہی اور دریافت کے انوکھے پہلو کو پانے کے احساس سے سرشار ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح عارفی صاحب کے کلام کے پس پردہ جہاں گھوڑوں کے سموں کی آواز سنائی دیتی اور دہشت و بربریت کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ وہیں ایک مقتدر خالق کے حضور اشکباری اور اپنی بے بضاعتی کے باوجود اولوالعزمی و انسانی شرف و رفعت کی بازگشت بھی قاری کا تعاقب کرتی ہے

پاس مقتل کے مرے کوچہء دلبر نکلا
دار سمجھے تھے جسے یار کا دفتر نکلا
دشت پیمائی کی تکلیف اٹھائی نہ گئی
دشت پیمائی کا ساماں تو میسر نکلا

اس میں لذت بھی ہے تلخی بھی ہے تنہائی بھی
ہجر کا دن تو شب وصل سے بہتر نکلا
کون یہ آخر شب کر گیا مجھ کو بے تاب
کون یہ گھر کو مرے آگ لگا کر نکلا
ہر طرف پھیل گئی ہجر کی زردی مظہر
چاند چہرے پہ لیے درد کی چادر نکلا

❁

کسقدر وضعدار ہیں ہم لوگ
قبر میں بھی سفید پوش رہے
ہم نے اک بات سرسری کی تھی
آپ کیوں عمر بھر خموش رہے

❁

شیشے میں جو ہو جائے سفارش کی پری بند
پھر شہر نہ دیہات نہ پنڈی نہ مری بند
کچھ حبس بھی بڑھ جائے اندھیرا بھی سوا ہو
کر دینا دریچوں کو مری جان ذری بند
منزل کی ہو خواہش تو نکل آتے ہیں رستے
نیت ہو اگر نیک تو خشکی نہ تری بند
ہے عشق کا آزار نہ آشوب جنوں کا
اک عقل کی آواز تھی سو تم نے کری بند
لگتا ہے کہ مظہر پہ کوئی ہو گی عنایت
نکلے ہو پہن کر جو سیاست کا پری بند

❁

عاشق صادق ہوں فرزانہ نہیں
میرے اندر عقل کا خانہ نہیں
میں گیا موسم نہیں ہوں وقت ہوں
مجھ کو واپس لوٹ کر آنا نہیں
نیک ہونے کا ہے نیت پر مدار

نیکیوں کا کوئی پیمانہ نہیں
کوئی منزل ہے نہ کوئی راستہ
اب کہیں آنا نہیں جانا نہیں
دل پہ دستک دے رہے ہو کس لیے
گھر میں کوئی صاحب خانہ نہیں
جاؤ لے آؤ شرافت کی سند
کیا تمہارے شہر میں تھانہ نہیں

✸

عرش پر جب اثر گیا ہو گا
نالہ بھی تا سحر گیا ہو گا
جانتا ہوں دعا کے موسم میں
وہ اکیلا کدھر گیا ہو گا
نارِ نمرود بجھ گئی ہو گی
صحن پھولوں سے بھر گیا ہو گا
دار پر شب گزر گئی ہو گی
لوٹ کر کون گھر گیا ہو گا
اُس کی آواز کی صداقت پر
لفظ لذت سے بھر گیا ہو گا
روزناموں کا نامہء اعمال
میری خبروں سے بھر گیا ہو گا
عہد غم میں نجانے کس کس کی
جاں گئی ہو گی سر گیا ہو گا

✸

مٹ گئے ہوں گے عہد کے آثار
وہ ستمگر جدھر گیا ہو گا
دیکھ کر میری مسکراہٹ کو
اُس کا چہرہ اتر گیا ہو گا
مجھ کو خبروں سے مارنے والا
سرِ اخبار مر گیا ہو گا
دن چڑھے آنکھ کھل گئی ہو گی
سارا نشہ اتر گیا ہو گا
لوگ جاتے ہیں اپنی مرضی سے
وہ بہ رنگ دگر گیا ہو گا
آؤ مقتل کی سیر کر آئیں
کچھ تو موسم نکھر گیا ہو گا
خونِ ناحق سے ہی سہی مضطر
اس کا دامن تو بھر گیا ہو گا

✸

اٹھتے اٹھتے اٹھے نقاب بہت
ہو گیا کوئی بے حجاب بہت
بخش دے تو مجھے بغیر حساب
مجھ کو اتنا بھی ہے حساب بہت
کچھ تمہارا سوال بھی تھا غلط
ہو گیا وہ بھی لاجواب بہت
مسکرا کر ملا کرو ہم سے
اس کا ہو گا تمہیں ثواب بہت
اور بھی پھول ہوں گے دنیا میں
ہم کو ہے ایک ہی گلاب بہت

✸

تصدیق چاہتا ہے اگر، آفتاب لا
منہ بولتا ثبوت کوئی ہمرکاب لا
جس کا عدالتوں میں حوالہ دیا گیا
وہ اقتباس میں بھی پڑھوں، لا کتاب لا
اتنا تو دیکھ آ رہا ہوں کتنی دور سے
اے بے مقام! میرے سفر کا ثواب لا
کب سے گھرا ہوا ہوں صدا کے حصار میں
میرے مجیب! میری فغاں کا جواب لا
پاؤں میں اس کو روند تا پھرتا رہا ہے تُو
اللہ کی زمین کا مضطر! حساب لا

✸

سہل ممتنع، سادگی میں پرکاری، بات کہنے کا سلیقہ ،تصوف کا تڑکا اور متقدمین و متاخرین سے استفادہ کرنے کے ساتھ ارتقا پذیر معاصر زبان میں اظہار کرنے کی قدرت اور اظہار میں سلاست مضطر عارفی کے کلام کو ایک عجب انفرادیت بخشتی ہے

ہر دید حضوری تو نہ ہووے
اور دوری بھی دوری تو نہ ہووے
سیکھا نہیں جاتا عشق کا فن
یہ بات شعوری تو نہ ہووے
الفت ہے خود آپ اپنی منزل
یہ چیز عبوری تو نہ ہووے

✸

زخم کرید و، شور کرو، فریاد کرو
بنجر راتیں رو رو کر آباد کرو
سرخ سنہری آگ جلاؤ اشکوں کی
گھر بیٹھے سیر اسلام آباد کرو
قاتل ہوں، مقتول بھی ہوں، مقتل بھی ہوں
کس حیثیت سے بولوں ارشاد کرو
ناداں، نالائق ہے، عقل سے عاری ہے
عقل کے اندھو مضطر کو استاد کرو

✸

اس فیصلے میں میرا اگر نام آئے گا
تہمت لگے گی تم پہ بھی الزام آئے گا
کب تک رہے گی خلقِ خدا اس کی منتظر

کوئی تو آسمان سے پیغام آئے گا
سائے کی طرح ہر کوئی دیوار گیر ہے
وہ جائے گا تو خلق کو آرام آئے گا
خوشبو پہن کے نکلی ہے آواز عہد کی
لگتا ہے کوئی صاحبِ الہام آئے گا
مضطر کو جلنے دیجئے فرقت کی آگ میں
پتھر پگھل گیا تو کسی کام آئے گا

❁

اے اہلِ شہر، شہر کے دکھڑوں کی داستاں
لکھوا لیا کرو کسی اچھے ادیب سے
آئیں خبر فروش تو اُن سے ملاؤ ہاتھ
مقتل میں جا کے صلح بھی کر لو رقیب سے
اب آئینوں میں شہر کی قسمت پڑھا کرو
ہیں صورتیں نئی نئی، چہرے عجیب سے
اب کر سکو تو آپ ہی اس کا کرو علاج
درماں کی کچھ امید نہ رکھو طبیب سے

❁

یہ اک اور قیامت ڈھائی لوگوں نے
یار سے جا کر چغلی کھائی لوگوں میں
لین دین کے صاف، گرہ کے پورے ہیں
ایک سنی تو لاکھ سنائی لوگوں نے
اپنوں کے گاہک بھی ہیں، بیوپاری بھی
بیچ دیا یوسف سا بھائی لوگوں نے
چہرے نوچ کے پھینک دئے آوازوں کے
لفظوں کی دیوار گرائی لوگوں نے
کرنے کو تو ایک اشارہ کافی تھا
ناحق شور کیا سودائی لوگوں نے

❁

پھر کسی سوچ نے گھونگھٹ کھولا
دُور اندھیرے میں پھر کوئی بولا
کچھ فرشتے تھے جو آڑے آئے
آدمی کوئی نہ ہنس کر بولا
ہم نے میزانِ عدالت دیکھی
عشق تولا گیا تولہ تولہ
یوں نہ دھل پائے گا دل کا دامن
آنکھ کے پانی میں جا کر دھولا
رات بھر روتا رہا ہے مضطر
اس کو سینے سے لگا لے ڈھولا

❁

میں جب بھی سرِ دیدہء تر گیا
نہاں خانہء دل سے ہو کر گیا
اندھیروں کے انجام کو دیکھنے
سرِ چشم تاروں کا لشکر گیا
ستارے ستاروں سے ٹکرا گئے
خلاؤں کا دل شور سے بھر گیا
سبھی راستے دشت میں رہ گئے
میں خود دشت کے پار اکثر گیا
میں بیٹھا رہا دل کی دہلیز پر
نہ باہر رکا میں نہ اندر گیا
وہ صدیوں سے اس گھر میں آباد ہے
ابھی چاند کھڑکی سے باہر گیا
ازل آرزوؤں کی دیوار پر
جو بیٹھا ہوا تھا کبوتر گیا

❁

کسی کے روکنے سے کم رکے گا
یہ طوفاں خود بخود یک دم رکے گا
طلوعِ صبح تک ہے شورِ محشر
گھڑی بھر میں یہ زیر و بم رکے گا
ہوس کی آگ ہے جلتی رہے گی
دھؤاں اٹھتا رہے گا، دم رکے گا
بتا اے کاروبارِ غم کے خالق
کبھی یہ کاروبارِ غم رکے گا؟
یہ چلتا چوک ہے چہرے چھپا لو
یہاں ہر ایک نامحرم رکے گا

❁

میں بچھڑ تو گیا، جدا نہ ہوا
مجھ کو فرقت کا غم ذرا نہ ہوا
لاکھ سمجھایا، لاکھ دھمکایا
یہ گنہگار پارسا نہ ہوا
لاکھ دعوے کیے خدائی کے
بندہ، بندہ رہا خدا نہ ہوا
ہو گئی کائنات زیر و زبر
رات کا تیر تھا خطا نہ ہوا
دل کی دنیا بدل گئی مضطر
اُن کے ہاں جب سے آنا جانا ہوا

❁

ہم ہوئے چشمِ باطنی نہ ہوئی
دن چڑھا بھی تو روشنی نہ ہوئی
غمِ جاناں بھی ناتمام رہا
زلف چھائی مگر گھنی نہ ہوئی
دوستوں کا بھی حق ادا نہ ہوا
دشمنوں سے بھی دشمنی نہ ہوئی
آہ تاریکیء شبِ فرقت
چاند نکلا تو چاندنی نہ ہوئی

حیف ایسے سرور پر مضطر
درد کی جس میں چاشنی نہ ہوئی

❁

چراغِ شام مرجھایا تو ہوگا
سحر کا رنگ گدرایا تو ہوگا
ابھی تک پتیاں بکھری پڑی ہیں
گلوں کا قافلہ آیا تو ہوگا
چلو دل کے خرابے ہی میں گھومیں
کہیں دیوار کا سایا تو ہوگا

❁

سحر نصیب ہے سچی دعاؤں جیسا ہے
وہ دیوتا تو نہیں دیوتاؤں جیسا ہے
نہ پان بیڑی، نہ سگرٹ، نہ جھوٹ کی عادت
یہ شخص شہر میں رہ کر بھی گاؤں جیسا ہے
رکے تو عین اذیت، چلے تو بادِ مراد
ہمارا اس کا تعلق ہواؤں جیسا ہے
جھگڑ رہا ہے صداؤں سے گھر کا سناٹا
یہ بے صدا ہے پہ لاکھوں صداؤں جیسا ہے
اگر برے ہو تو گھبرا رہے ہو کیوں مضطر
سلوک اُس کا بُروں سے بھی ماؤں جیسا ہے

❁

مضطر عارفی کے کلام میں ایک ڈرامائی تناؤ کی موجودی کے باعث کہیں کہیں ایسے پیکر سامنے آتے ہیں کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ پنجابی اور فارسی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ حمد، نعت، اور نعتیہ و حمدیہ اشعار پر کی گئی معرکۃ الارا تضمینوں کے پہلو بہ پہلو ان کی شہرہ آفاق کئی نظمیں آج بھی پڑھنے والے کے دل میں ہلچل مچا دینے اور اسے ایک عجیب کیف سے سرشار کرنے پر قادر ہیں۔ اساتذہ کی اکثر زمینوں میں کامیاب طبع آزمائی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ انہوں نے یہ بھاری پتھر کس بانکپن اور شان سے اٹھایا ہے۔۔ نظموں اور دیگر زبانوں کے کلام کو پیش کرنے کا یہ محل نہیں۔ لیکن اُن کے اپنے استعاراتی نظام میں۔ جو سہل الفہم ہے ذرا مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے۔

گل یہ کرتا ہوا فریاد آیا
کوئی گلچیں ہے نہ صیاد آیا
اب نہ تیشے کی غلامی ہوگی
نالہ کرتا ہوا فرہاد آیا
پھر سرِ شام ستارے ٹوٹے
پھر کوئی صاحبِ ایجاد آیا
پھر سرِ شاخ پکاری بلبل
پھر وہی موسم فریاد آیا
ہم نے اک عمر گنوا کر دیکھی
ہم سا کب خانماں برباد آیا

❁

ہجر کی رات مختصر نہ ہوئی
نالہ کرتے رہے سحر نہ ہوئی
ایسے سوئے کہ پھر نہ جاگے لوگ
دن چڑھا بھی تو کچھ خبر نہ ہوئی
ہم اسے آدمی نہیں کہتے
جس کی انجام پر نظر نہ ہوئی
اُڑ گئے خاک ہو کے راہوں میں
منزلِ شوق پھر بھی سر نہ ہوئی
تیرے ہو کر کسی کے کہلاتے
اک یہی بات عمر بھر نہ ہوئی

❁

تم نہ ٹالے سے بھی ٹلے صاحب
کیوں مری آگ میں جلے صاحب
آپ کو کیا خبر کہ دھوپ ہے کیا
آپ آئے ہیں دن ڈھلے صاحب
چھین کر چین ہم فقیروں کا
اب اکیلے کہاں چلے صاحب
دار سے یار تک پہنچنے کے
اور کتنے ہیں مرحلے صاحب
مسئلہ تھا تو جب بھی دل کا تھا
اب بھی دل کے ہیں مسئلے صاحب
ایک دو روز کی نہیں ہے بات
جلتے جلتے ہی گھر جلے صاحب
ان کو سکھلائیے گا استعمال
لفظ ہیں کچھ برے بھلے صاحب
ان کی پہچان ہے فقط خوشبو
لفظ گورے نہ سانولے صاحب

❁

آہٹ کا اژدہام بھی زنداں صدا کا ہے
آواز ایک سلسلہ کرب و بلا کا ہے
یادوں میں ہے اٹا ہوا آنگن خیال کا
ماضی کے اس مزار پہ پہرہ ہوا کا ہے
میں اس کے غم کی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا
خطرہ نہ اب ملال غمِ ماسوا کا ہے
میں ہی متاعِ عشق کا وارث ہوں، تو نہیں
اے معترض! یہ فیصلہ میرے خدا کا ہے

کچھ میرے کام آ گیا میر اعذاب دید
کچھ ازدحامِ حسن بھی مضطر بلا کا ہے

❁

رستوں سے پرے جو راستہ ہے
تیری ہی طرف تو جا رہا ہے
زنجیرِ صدا کا شور سن کر
آہٹ کا اسیر کانپتا ہے
کشتی کو ہے ڈوبنے کی خواہش
ساحل بھی قریب آ گیا ہے

❁

محفل ضبط و فغاں کی اب بھی قائل ہے
دل کو کون سنبھالے، دل کی مشکل ہے
عزت سے جینا اور عزت سے مرنا
پہلے بھی مشکل تھا اب بھی مشکل ہے

❁

فاصلے اور بڑھ گئے مضطر
جسم جب جسم کے قریب ہوا

❁

ہوس کی وہ آندھی چلی شہر میں
بجھی عشق کی آگ دوپہر میں
فقیروں کے چھپر سلامت رہے
محل بہہ گئے ایک ہی لہر میں
ضرورت ہے آج اس کی اخبار کو
اڑا دیجئے یہ خبر شہر میں

❁

ایک ہی خاندان کے ہیں فرد
آئینہ آنکھ سے جدا تو نہیں
اپنی مرضی سے بات کرتا ہے
اشک ہر وقت بولتا تو نہیں

❁

پھر کوئی آ رہا ہے جانب دل
دور افق سے پرے غبار تو ہے
یہ الگ بات در گزر نہ کریں
آپ کو اس کا اختیار تو ہے
یہ بھی کیا کم ہے بلبلِ ناداں
موسم گل تو ہے، بہار تو ہے
غم جاناں ہو یا غم دنیا
آدمی غم سے ہمکنار تو ہے

❁

عقل تنہا دل ناداں تنہا
جس کو دیکھو ہے پریشاں تنہا
اس کا مفہوم بدل جاتا ہے
زندگی یوں تو ہے آساں تنہا
ہم تو کافر ہیں بجا ہے صاحب
ہو تو اک تم ہو مسلماں تنہا

❁

روح زخمی جسم گھائل ہو گئے
ہر طرف پیدا مسائل ہو گئے
فیصلہ اب عقل کے ہاتھوں میں ہے
دل کی جانب سے دلائل ہو گئے
اب تو مضطر سے کوئی جھگڑا نہیں
جو گلے شکوے تھے زائل ہو گئے

❁

اینٹوں سے ہے سارا گھر آباد
اس خرابے کے ہیں کھنڈر آباد
گھورتی ہیں ہزار ہا آنکھیں
کہیں چہرے کہیں بھنور آباد

❁

شدت غم سے داغ داغ ہے دل
ایک گھر میں ہیں لاکھ گھر آباد
حد فاصل کو پار کون کرے
ہم ادھر اور تم اُدھر آباد
کون مضطر ادھر سے گزرا ہے
ہو گئی ساری رہگزر آباد

❁

کیا جانیے مجھ کو ہو گیا کیا
کہنا تھا کچھ اور کہہ دیا کیا
اشکوں کے چراغ جل رہے ہیں
گھر گھر ہے یہ آج رت جگا کیا
پتھر سے سوال کرنے والے
پتھر کو ہے تُو پکارتا کیا

❁

ناکام نہیں ہوتا محبت میں کبھی عشق
وہ عشق ہی ناقص ہے جو ہو جاتا ہے ناکام

❁

کشتیء نوح میں بیٹھے تو ہو مضطر لیکن
شرط یہ ہے یہیں جینا یہیں مرنا ہوگا

❁

بغاوت ہو گئی تیری گلی میں
مری سوئی ہوئی تقدیر جاگی
مصور کے قلم سے خون ٹپکا
خروش رنگ سے تصویر جاگی
غزل بن کر بہا خونِ شہید اں
کفن پہ شوخیء تحریر جاگی

❁

پھر زیرِ آب آ گئیں پھولوں کی بستیاں
سورج غروب ہو گئے شبنم کے شہر میں

سوچو تو دور دور کوئی آدمی نہیں
دیکھو تو ہم سے سینکڑوں پاگل ہیں دہر میں

صلح ہو گی نہ لڑائی ہو گی
وصل در وصل جدائی ہو گی
عشق بدنام ہے اول دن سے
کوئی تو اس میں برائی ہو گی
اک طرف ہو گا وہ جانِ خوبی
اک طرف ساری خدائی ہو گی

فرصت شام الم پوچھتے ہیں
یعنی اندازہء غم پوچھتے ہیں
ہم سے کیا صلح نہیں ہو سکتی؟
لفظ با دیدہء نم پوچھتے ہیں
دشت میں کوئی تو دروازہ ہو
کس طرف جائیں قدم پوچھتے ہیں

ہم اپنی طرف کم سے کم دیکھتے ہیں
جو دیکھیں تو با چشم نم دیکھتے ہیں
یہاں عشق معیار قامت نہیں ہے
یہاں لوگ دام و درم دیکھتے ہیں
محبت کا انجام کیا ہو گا مضطر
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں

ذکر شبنم نہ فکر خار کرو
گل کو چھوڑو چمن سے پیار کرو
آدمی آدمی کا دشمن ہے
آدمی کا نہ اعتبار کرو

مفت کی مے ہے، پی سکو تو پیو
فصل گل کا نہ انتظار کرو

کچھ یہاں اور کچھ وہاں گزری
خوب گزری جہاں جہاں گزری
حال دل سن کے ہو گئے خاموش
بات سچی تھی، کچھ گراں گزری
نُور میں ڈھل کے آنسوؤں کی پری
دیدہء تر سے پر فشاں گزری

کہہ رہا تھا نہ سن رہا تھا کوئی
عمر بھر بولتا رہا کوئی
اپنی تصویر سے لڑائی ہے
آئینے سے نہیں گلہ کوئی
موت کے بعد یوں لگا مضطر
جیسے پیدا ہوا نہ تھا کوئی

وہ یہیں آس پاس ہے اب بھی
اس سے ملنے کی آس ہے اب بھی
ایک آنسو گرا تھا پچھلے سال
شہر بھر میں ہراس ہے اب بھی
آنسوؤں کی زباں سمجھتا ہے
وہ ستارہ شناس ہے اب بھی
تیرا فردوس سے نکالا ہوا
آدمی بے لباس ہے اب بھی

دل و جاں پہ اس کی حکومت تو ہے
حکومت یہ اب تا قیامت تو ہے

اُسے دیکھنے سر کے بل جاؤں گا
اسے دیکھ لینے کی حسرت تو ہے
تمہیں بھی خوشی ہو گی مل کر اُسے
وہ،، کافر،، سہی خوبصورت تو ہے

جس نے دیکھا اسے دیکھتا رہ گیا
دیکھ کر اس کو پھر اور کیا رہ گیا
ہاتھ جب بھی اٹھائے دعا کے لیے
ایک میں ایک میرا خدا رہ گیا
چاند نکلا تو چھوٹے بڑے ہو گئے
نہ رہے، وہ جو تھے، جو نہ تھا رہ گیا
اور پھر یوں ہوا دیکھتے دیکھتے
شکل گم ہو گئی، آئینہ رہ گیا

گرنے کو ہے مکان مگر تم کو اس سے کیا
سر ہے نہ سائبان، مگر تم کو اس سے کیا
وہ بھی تھا امتحان سر دشت نینوا
یہ بھی ہے امتحان مگر تم کو اس سے کیا
کیا جانتے ہو کس نے اجاڑا بہشت کو
تم ہی نے میری جان مگر تم کو اس سے کیا
جاگو کہ رات ختم ہوئی صبح ہو چکی
ہونے کو ہے اذان مگر تم کو اس سے کیا
مضطر تمہارے سائے سے بچ کر نکل گیا
اللہ کی ہے شان مگر تم کو اس سے کیا

Remembering a legend . . .

Chaudhry Muhammad Ali M.A.
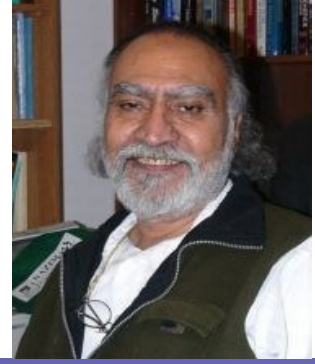
Muhammad Zafrullah

It was with great sorrow I learned that our beloved teacher and great servant of Jama'at Ahmadiyya, respected Prof.Ch. Muhammad Ali M.A. passed away on Friday, August 14, 2015 at Rabwah. Inna Lillahe Wa Innaalehe Rajeoon. Rest in Peace Chaudhry Muhammad Ali sahib.

He was 97and his health had been deteriorating for the past couple of months.

My heart is filled with sorrow and a sense of great loss. Allah, have mercy on our dear departed and elevate the status of Chaudhry sahib in Heaven.

I am sure all alumni of T.I. College Rabwah share with me the same sorrow which students have always felt at the departure of a great and beloved teacher.

Chaudhry sahib was a prominent star among the great teachers at T.I. College. He joined the college in Qadian in 1944 and saw all the stages of success of the college at Lahore and Rabwah. No doubt he was one of those professors who served the college not only for the longest period but also most efficiently and made deep impact on the culture of the great institution he had contributed so much to.

Born in 1917, he got his Master's degree from Government College Lahore and served the academia in various capacities; here a teacher there a head of philosophy department and a delight as an Urdu poet and a writer. He had established and distinguished himself as an academic and a literary figure before he joined T.I. College. He also served on the Senate of the University of the Punjab. So a great Pakistani academic and a scholar passed away people!

On paper he had an M.A. in Philosophy but packed a vast amount of knowledge when he wrote or talked about a topic. He not only had an in-depth knowledge of classical logical and philosophical approaches but also was abreast of the then current philosophical trends. I learned about Jean-Paul Sartre and his Existentialism from Chaudhry sahib.

It would be unfair not to mention his colossal command over English, Punjabi and Urdu. While he was adept at teaching logic, philosophy and topics on contemporary thought, he could and did teach English literature when needed. A lot of folks know him and of him through his Urdu and Punjabi poetry.

He served the college in many other capacities: as an administrator; hostel warden; college principal; and even as a basketball coach, and left his indelible mark everywhere. Like most of the students of T.I. College, I was not a psychology or philosophy student, but as I have indicated, I did

learn from him about things which I was not ordinarily supposed to know.

One of the many things that I learned from Chaudhry sahib was that you cannot make predictions about human behavior and I have actually written an Urdu article about how I learned it. See http://www.lohar.com/College%20days.pdf

I have often mentioned the example given by Chaudhry Sahib on the internet. The one such occasion that came up in the search was this:
https://plus.google.com/107515659286220537603/posts/A3rZHhcVKc5

Some readers may not want to go chasing the links and a change of language. For them I am giving a gist of the episode which rightly was a formative episode in my life. I read a news item about a man hitting another man for not saying Salam to him. That kind of set a train of thought in motion and I got a bee in my bonnet about what could have caused this kind of behavior.

I went around to various professors who I thought could have resolved the issue for me. Frankly, I never thought he was the go to person. I saw him as a hostel warden and as a basketball coach who seemed to speak good English and wrote good poetry. I had no inkling of his glorious past. He was so unassuming that he never brought up the fact that he had clout as a professor and as a member of the University Senate.

Anyways, everyone that I went to see about my “problem” was sort of judgmental. They said they wouldn't hit a person for not offering salutations. Inwardly I thought that offering Salam was sort of acknowledgment of other person's social status and one’s own being at a lower rung socially, and not offering Salam to a man with higher status could be perceived as an affront. Coupled with historic evidence of some rulers beheading folks for not bowing in front of them, I thought I was right.

Engrossed in these thoughts I passed by Choudhry Sahib's residence and thought of trying him out too. He heard my story, looked me straight in the eye and said, "You cannot make rules about human behavior. Consider two men on bicycles, coming from opposite sides, colliding against each other and falling. You can be sure that bicycles would stay where they fell, but you cannot predict what the two men would do, whether they would get up and help each other or they would fight." All the thought of social status evaporated from my mind!

As I have known him more as a hostel warden, let me talk about him in that capacity. He was for strict discipline and made sure that the business of the hostel ran according to rules. But he was kind at heart too. The attendance at the Fajr and Isha prayers was compulsory and absence meant fines. Essentially being lazy I'd often thought that prayer was between a person and God and I would usually say my Isha prayer late while saying Fajr prayer was hard anyway. So the fines would run into over hundred rupees in a year. Knowing how poor I was, Chaudhry Sahib would always forgive those fines.

I always found him calm and cheerful unless the situation demanded that he should be strict. I remember some boys talking in a sort of frivolous manner. Chaudhry Sahib waited for a minute or so for them to realize who they were talking to then came: "Be facetious, not funny!" and all fell silent. That was one of the very few times I heard him rebuke someone in public. Of course I have had the dubious honor of facing his anger more than once and I can tell you that he could give one a big chunk of his mind, but always in private. It seems to me that he did not want to rebuke or humiliate his charges in front of others and often was ready to forgive.

It was my first year at college. Life was tough, the medium had changed and I no longer had the facility of reading course books like novels, so I had to put in a lot of work. That meant working till late at night. Chaudhry sahib would sometime

make round s in the morning to wake us up for Fajr prayers.

It was one such morning and I had just gone to sleep when Chaudhry sahib came in to wake us up. As he pulled the cover off me, my reaction in deep sleep was to raise my hand in the manner of a slap. According to my roommates, Chaudhry sahib was taken aback and asked, if I had gone crazy. My roommates told him that I had been studying all night and had just gone to sleep. Chaudhry sahib let me sleep and never brought this incident up.

Studious and according to some a bright student, I was no angel especially when Malik Hamiduddin Nasir and I got together. In later years at college I had moved to the annexed quarters to escape some of the strict rules of the hostel. Hamiduddin would often come to stay and in addition to smoking like chimneys we would often cook up some escape plan, which usually meant going to Chiniot to watch a movie. This happened when one of us had a few extra rupees. I had a non-Ahmadi uncle (he was married to a non-Ahmadi aunt of mine) in Chiniot and we always thought he was a good cover. We usually came back on foot or by train.

This went on for a while until one night we boarded a bus and lo and behold a big mouth older cousin of mine was in the bus and so was DPE Muhammad Ahmad Anwar sahib and possibly some other teachers! My cousin had a field day, or shall I say a field night, at taunting us. He did enough to make sure that we'd have hard time explaining our position. We had no problem explaining our position. I wanted to meet my aunt and her children and Hamiduddin tagged along. In the evening when we decided to return, my uncle insisted that we watch the movie which he thought was good. We couldn't say no and we are sorry. My uncle was an auto electrician and known to some professors. It worked with everyone else, but not with Chaudhry Sahib!

Two or three days later he caught me as I was coming out of the tuck-shop in the evening after a cup of tea. Coming straight to the point, he goes: Zafrullah, you have shredded college rules to pieces, and I thought you were a diligent young man trying to improve your lot. But you are wasting your time! He never brought the Chiniot excursion up but we both knew what he was referring to. I was a bit more careful after that.

The last example of his strictness comes from when he was the principal and I a freshman teacher at T.I. College. Some folks thought, as they often do, that because I was a "professor" now I could get their son admission at college after he was denied admission. I never believed in that kind of thing but got forced into doing it. So, I was sort of suicidal, anyway.

I took the boy with me to the principal's office. Chaudhry sahib saw the papers and came up with the verdict that was obvious. I made a remark about similar cases being admitted. In private such a remark could have got an explanation, but I blurted it out in front of the boy! That was inappropriate. Chaudhry sahib gave me a look, turned calmly to the boy, told him to wait outside and, unloaded all the day's anger on me. I think if I hadn't had a past at the college and if there was another principal I sure would have been fired. Luckily soon after that episode, I left for Britain for my doctorate and Chaudhry sahib never brought that subject up.

If as an administrator he was strict, as a subordinate he was all obedience and service. Of course, Hazrat Mirza Nasir Ahmad sahib's personality attracted love and obedience anyway. After Hazrat Sahib was elected as Khalifa, Qazi Muhammad Aslam sahib was appointed as the principle. I never heard of Choudhry Sahib taking a stand against the principal.

Qazi Sahib lived alone at the principal's residence. Chaudhry Sahib was often seen with Qazi Sahib after the college hours to give him company. Because of my notoriety as a possible future philosopher, I was often attracted/ snagged/ invited to accompany Qazi Sahib and had the chance of seeing those two giants together. They would be talk-

ing about the etymology or meanings of some words or talking about a book by some famous author or philosopher.

On the service front I must say that if you can find a poet who is also a scholar who would willingly be a rowing coach or a basketball coach or a warden of a hostel then that person would be Chaudhry Muhammad Ali. What is remarkable is that Chaudhry Sahib performed as a warden and a basketball coach simultaneously and the coaching wasn't just from outside, he was often seen on the court!

Behind his hard exterior and relentless workhorse persona there was a thoughtful and caring being. In the second year, I got to know some fellow students from Mauritius. Of course they were looking for some company and I was looking to improve my English speech. They were mostly medical students. My curiosity got me interested in medical enough that I started missing my regular classes to attend biology lectures and became regular at the Zoology lab.

Word got out that I was planning to change my subjects from non-Medical to Medical. One day a fellow student told me that Chaudhry Sahib was very disappointed since I had started as a bright non-Medical student and now I was getting confused. Well, he didn't have to worry much. I had seen a few liver punctures of rabbits and was seriously rethinking about my interest in becoming a doctor. But it tells you how much Chaudhry sahib cared. If he cared for me, he must certainly have cared for many others.

Great teacher, great person, great administrator and a great servant of Jamaat Ahmadiyya! Rest in Peace Chaudhry sahib. I wish I could see you in old age but thanks to our circumstances it was not to be.

Vol 2, No 2—October 2015
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA